



دن اور داشتہ

امن جاری

(۱)

ماضی اس کے تینیں بھی راتوں اور گھری دو پہروں کا ایک سلسہ تھا، پنج بج میں کوئی بھی
صبح، کوئی بارش سے شرابور دن مانند موئی کے گویا ہوا: دو پہر میں گلی گلی کمیت کیست کا سفر، راتیں
لاسا فربے فرنگ بے سمت، سوتے جاتے بنکارتے مسافر، کبھی رنج کا اور کہانیاں، کبھی خواب کا
عالم کہ انکھیں بند ہیں اور پلے جاتے ہیں، اچھے خبر نہیں کہتنی دوڑنکل آئے کہتنی دور جانا ہے جب
حوالی سب سو جاتی اور گلی باہر سنا ہئے لگتی تو یہر بولی کے بنکار نے کی آوازیں آتیں جویلی کی بغل
میں کچی پیکی ایک کوٹھری بھی اور ایک احاطہ، جاڑی سے اگری، ابر سات وہاں آسمان سکے سوتے برائے
نام سونا اصل میں بنکارنا، ہما و نوں اور عینہ بوندی کی لگتی کی راتیں کوٹھری میں چھت کے نیچے
گزرتیں سونکارنے کا سلسلہ طول پکڑ جاتا اور محلہ جاگ ماگ اٹھتا۔ بنکارتے تھے اور
اندھیرے میں تیر چلاتے تھے کہ ہمیشہ نشانے پر پڑتے تھے۔ ایک رات بنکارتے بنکارتے
چلانے لگے «نکل گیا، نکل گیا،» صبح ہوئے یہ خراپی کہ لکھر کھڑرے میں ڈاکر پڑ گیا۔ تانی اماں
بتایا کرتی تھیں کہ جملائی وظیفہ ان کا لگدا گیا تھا، اب ہزار قبضے سے باہر ہے، رات کو سونے
نہیں دیتا۔ جملائی وظیفہ اور ہزار دے کے ذکر ہے اس کے اور تحدید کے کان ادبد اکر کھڑے ہوتے۔
تانی اماں خود بھی جیران ہونے لگتیں: انہیں تو بس آنسا پستہ تھا کہ پلے کی چالیسویں رات کو
بیر بولی کوٹھری سے چلانے لگے «گریڈی گریڈی»، بھر جویلی کا پچاہک پٹنائش روچ کر دیا۔
ابھی بڑے ابازندہ تھے کہ رات رات بھر جادت کرتے، آہستہ سے جادہ نماز سے اُٹھتے،

چھاہک حکور، میر علی بھانگ پستے تھے اور چلاتے تھے مگر پڑی، گر پڑی، بڑے اباۓ نگھو کر پوچھا
”کیا گر پڑی؟“ وحشت میں جواب دیا، ”چھت“ وہ دن اور آن کا دن کہ پھر کبھی چھت کے نیچے
سو ناصیب تھا۔ بکھی چھت تھے یعنی تو بڑی طرح ڈکراتے چلاتے اور ملے والوں کی نیندوں
میں خلل ڈلتے۔ دن نکھلا تو مردہ سے ہو جلتے، ڈکرانا نہ بن کارنا نہ کسی سے ہے بولنا، جھلنگ پہ بیٹھے
کھڑی ہے اور نیچے رہے۔ وہ اور تجھیسہ بہت بہت دیر تک اعلیٰ سے باہر کھڑے انبیں تکتے
ہتھے، ڈرتے حیران ہوتے، پھر آپ، ہی آپ دہان سے پل پڑتے اور ایک تھے گڑھے شاہ کہ
بس تال اماں نے انہیں دیکھا تھا۔ میر علی اسکھوں دیکھی حقیقت تھے، گڑھے تباہ تاہی اماں سے
نسا افسانہ۔ مجد و بہت، حوالی کی دیوار تھے ڈبرہ ڈلا تھا، انجلیوں سے زمین کھ دتے رہتے،
کوئی پوچھتا تو جواب دیتے۔ ”فیقر رہنے کو کھرنا تاہے،“ گڑھا ذرا اگر اہوا تو اندر اس کے بیٹھے
گئے۔ ایک روز بڑے ابا پاس پہنچے، گزارش کی ”شاہ جی حویل حاضر ہے،“ اس میں ٹویرا کرو، ہاگڑھے نہ،
بلے اعتنائی سے بوئے ”حویل زمین کے نیچے ہے۔“ بڑے ابا کو مریدا کھا، ترطیخ کر جواب دیا۔ تو
زمین کے نیچے ہی نا اور ہم، دوسرے دن نہ گڑھا تھا نہ کہھے تباہ تھے۔

وہ اور تجھیسہ سنتے اور حیران ہوتے۔ تال اماں حیران ہوئیں، پھر معنی جیز اندرا زمیں پہ،
ہر جا قیس پھر جپ لوثی اور کھن لگتیں۔ ہمارے ابا بہت بڑے عامل تھے، ہمارا تو بیٹا خاندان
علمون کا خاندان ہے۔ آگے ہماری ہر پڑی میں ایک عامل ہوا کرتے تھے، پر بڑے ابا کے
بعد سلسلہ پند ہو گیا۔

”کیوں؟“

”کوئی لگدی ان کی سنبھالتے والا جو نہ تھا۔ ابا میاں کے شغل شغال اور نہ تھے، باپ کے
تم پر کبھی توحہ ہی نہ کی، دوسروں کے پاس چلا گیا کیا ہوا کہ جب بڑے ابا ہر پانی پہ بڑے
تو ایک نگا فیقر جنیں کھا سئے آیا، حویل کے سامنے دھنی دے دی۔ بڑے ابا کی حالت بگریتی
پہنچی اور اب دھماک دم پھرنے لگے۔ تین دن بڑی مالت رہی، سالس سگلے میں اُنکا ہوا، وہ

ربک اللہ توہ بی بی تیرے دن کی ہوا کہ وہ ننگ و ہر زنگ سندھ مٹنڈہ لندنگ گھر میں گھسن
یا آیا۔ عورت میں چلا نے لگیں اپر بڑے اپنے اشارہ کیا کہ آتے تو سب دم بخود اسے بی بی وہ
بڑے ابا کے پاس بائیسے سے چھٹ گیا۔ بڑے ابا ہر قصر کے اور ختم
و اپنے چلا گیا۔ پھر ایسا غائب ہوا کہ لوگوں نے ٹھونڈا یا ٹوٹا اور اس کا پتہ نہ چلا اس
اس دن سے جو یہی والوں میں کوئی عامل نہیں ہوا

ناندان کے بزرگوں کی یادیں اور باتیں جن بھولوں کے قصہ، کبھی کہانی کوئی، تائی اماں
کی داستان ہر زنگ بخاری رسمی اور رات بھیگنے لگتی اور انکھیں اس کی نیند سے پہلے بخاری ہوئیں
پھر نیند ہونے لگتیں۔ اسکے پھر کھنڈی تو سب سوئے ہوتے ہوئے، خاموشی، خرائے، اندر ہیر، خوابوں کی
سرحد سے آتی ہوئی ہیر بوعلی کی بتکار، دل قند سے دھڑکنا اور رات باتے سنجھنے لگتے: پھر پہنچتا
کہ وہ تائی اماں کی پار پائی پہ نہیں بڑی اپا کے بستہ میں ہے اور آہستہ آہستہ سرک کروہ بالکل بڑی
اپا کے پہلو میں ہو جاتا اور ان کے گزار اور خبت بھرے پہلو سے نکلتی گرمائی دھیرے دھیرے
بھر، س پر سدیں کر جانے لگتی۔ دوبارہ انکھیں اس کی کھنڈی تو پھر وہی خاموشی اور خرائے
دراندھیر، کالے کوس آگے کالے کوس تجھے، نگھنی نہ ساختی، خوابوں کی سرحد سے آتی ہوئی
ہیر بوعلی کی بھید بھری بنکار کے منگت چھوڑ جاتی اور نیند بھی، وہ جاندار ہنسا اور رات بلی
ہوتی جاتی اور دم اس کا بہال کہ بدن سے بحاف۔ اس دیتا اور اندر ہیرے میں انکھیں بچاڑھجڑا
زیکھنے لگتا، اتنے میں اپنیک آواز اذان کی کان میں آتی کہ اس سے اندر ہیرے میں نور کی ایک
لکھنچنی دکھانی دیتی، اسے اطمینان ہونا کہ رات اب آخر ہوئی۔ پھر لال مندر جائیتا، سنکھ اور کھڑتا ہیں
اور کھنڈیاں نجھنے لگتیں، اندر ہیرے میں روشنی کا ایک بھنور پیدا ہوتا، دھیرے دھیرے ابھرتا
بھیلتا اور دوب جاتا۔ پھر وہی خاموشی، جانورات ختم ہوتے ہوئے پھر تردد ہو چلی ہے
اندر ہیرے میں پھر اس کا دم اُٹھنے لگتا کہ اتنے میں روئی کا یہ بول اٹھتا، روئی کا ایک یہ بوج دنبا پھر
محضوں سے وقفنے کے بعد دوسرا پیچ، پھر آوازوں کا ایک تار بند ہو جاتا گو یا اندر ہیرے کی تپٹ

گئی ہے اور روشتنی کی دھارہ نکلی ہے، کوئی جھوجھری آواز، کوئی پتیلی آواز جس میں کمی پڑتے ہے، اور ایک پیچ تھاکہ مثل ریل کے انجن کے تیزی سے سیٹی دیتا اور چپ ہو جاتا اور پھر اس سب سے موئی اور بھاری والی آواز والے پیچ کی آواز، رات کی رخصتی کا سب سے طویل نوحہ بھاری اور لکسان آواز میں بولتا رہتا، بولتا رہتا، اور وہ تمباک جسیج تک یونہی بولتا رہے گا، مگر اہمتر ہے آواز دھلنے لگتی اور بھروسہ خاموشی۔ رات کی رخصتی کا سب سے طویل نوحہ سب سے آخری اعلان بھی تھا کہ بعد اس کے کوئی پیچ نہ بولتا اور دن میں دوپہروں کے سفر کی آخری منزل کے وہاں پہنچ کے تھے اور اس سرخ اینٹوں والے موٹے محسوسون کو کہ بلند ہوتے ہوتے آسمان کو چھوٹا نظر آتا دیکھ کے جیرا رہ جاتا۔ فضابیں بلند یوں کی یہ انتہا زمین پر لک کی آخری سرحد تھی، جہاں سے آگے قدم رکھتے ہوئے وہ سوچنے لگتا کہ اب اجنبی ملک کی عدیں شروع ہوتی ہیں۔ اجنبی ملک کے علاقے کو وہ دور سے دیکھتا اور واپس ہو لیتا۔

جلتی دوپہروں میں ہوا بند ہو یا اللوں علیتی ہو یا آندھی اٹھتی ہو کہ ستر بلائیں ساختہ لاتی، آفادہ گھومنا، گھوستے رہنا، کبھی پیڑوں کی چھاؤں میں کبھی گرم گرم بالو جیسی ریت پہ اور کبھی ہرے بھرے کھیت میں، اتنا چلنا اتنا چلنا کہ مانگیں دکھنے لگتیں اور تجیہت کا گورامہ سرخ ہو جاتا اور بالوں کی لیڈیں پیسنے سے تر بر کپیتی پہا اور گردن پہ آکر چلک جاتیں۔ واپس جلتے ہوئے مندہ والی گلی میں، مندہ والی گلی سے پیاؤ کی گلی میں جہاں پانی پیتے تھے ماندہ لاتھ دھوتے اور بھرا ہی گلی میں۔ مندہ والی گلی سے گز رہتے ہوئے اس پہ بیسبت سی چھا جاتی۔ سرخ پھر وں والا مندہ کہ دھوپ میں دور سے آنکھ دیتا۔ اس کے نئے ہمیشہ ایک سعید رہا، اس کے اندر کون رہتا ہے، افغان کرجن: سکھ اور کھڑتا لیں اور گھنٹیاں کہ روز تڑ کے میں اول شام پڑے پہ بجھنے لگتی ہیں، کون بجا لاتے ہے بست اونچائی پہ چھوٹی سی کھڑکی میں لگی ہوئی لوہے کی چرخی کہ دوپہر میں ثانٹ رہتی ہے اور دھوپ ڈھلنے لگتی ہے تو آپ، ہی آپ گھومنے لگتی ہے اور سفید دھوپ میں بندھتی ہوئی پتیل کی چمکتی گردی بیچ ہوتے ہوتے کنوئیں کے اندر جس سے میں سچن سے گرتی ہے جانو

کسی نے مخفی بھرا شر فیال پھینکی ہیں اور بچھر غائب، بچھر تھوڑی درمیں پانی سے لباہب چکنی دیکتی نکلتی ہے، اور پر ہوتی جلی جاتی ہے اور کھڑکی کے پاس پہنچ کر اچانک گم ہو جاتی ہے، گڑوی کون ڈالتا ہے کون چینچتا ہے اور یہ اتنی بلی ڈوری کہاں سے آئی، سوچ کی ڈوری بلی ہوتی جلی جاتی، اتنی بلی کہاں سے سرانگھل جاتا، اتنے میں کوئی پیلی بھٹمن کے اس پاس کسی کچی گچی سے اٹھتی اور اپنی طرف متوجہ کر لیتی، سرخ پھرلوں والیں تو دھوپ میڈیہ پتی کروہ پاؤں رکھتا تو جلنے لگتے، مگر اس پاس نہیں منی کچی گچیاں بخیں، جن میں پانی جمع رہتا وہ جہاں کوئی اکسلی بھیسری پانی میں بیٹھے بغیر پانی پسائی کی طرح متھلاقی رہتی، معلق بچھر کنی بن کر گردش کرتی رہتی یا کوئی سنہری چیزوں کا لے بیکے والی انجمناری کنارے پر اترتی، ڈنک گوگڑا ش دینی اور اڑ جاتی۔ ہاں پیا وکی کلی میں کہ مندر والی گلی سے آگئے تھی۔ دوپھر بچھر چھاؤں رہتی اور پیا و سلپتا رہتا دو نوں پانی پتے، بچھر اس تکھنڈی نالی میں کھڑے ہو جاتے جو بیوں اُبی تھی بُر گاہی کی بلکن نہ جم جلنے سے رپڑاں ہرگئی تھی۔ پر ڈنک کے اوپر سے تھنڈا تھنڈا اپانی بچھل کر بمنار رہتا اور وہ کھڑے رہتے۔ ایک روز اسی طرح کھڑے کھڑے اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ ایسا چیلہ کہ سارا گلہ چھل گیا۔ تھینہ کھل کر ہنس پڑا۔ وہ رونماں سا ہو گیا مگر بچھر چب ہو گیا۔ رستے بھراتے تھینہ پر بخت غصہ آتا رہا اور جب کھنڈاں کے پر ڈپر جا کر اس نے تکھنڈاں کی ایک ہری لجکتی ہوئی سندھی توڑی تو اسے تھینہ کو دینے سے اس نے صاف انکار کر دیا۔

”غیرہ میں دے دے یہ سٹلی۔“ تھینے کے منہ میں پانی بھرا یا تھا۔

”کیوں دے دو؟“ اس نے روکا جواب دیا۔ ”دے دے، تم تجھے گھر چل کر نیلا شیشہ دیں گے۔“ اس نے بچھر برڈی غوشاد بھری آفائز میں کہا۔

”برڈی دے گی شیشہ جاؤ نہیں دیتے ہم۔“

تھینہ ایک دم سے چب ہو گئی، میںے روٹھ گئی ہو۔ وہ خود پر ڈپر جوڑنے لگی۔ بچھر پر وہ اچھ خاصی چھڑھ گئی تھی، لیکن وہ بار بار ٹوکتا۔ قدم ذرا ڈککایا اور اس نے سورچا یا۔“ وہ گری۔ تھے

پھر سچل جاتی۔ آنزوہ ایک ہوتے ہے کہ سمجھ کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور منظر توڑنے لگی۔ جو رہے ہوئے پلٹت محتی، بار بار ذرا تیز ساجھن کا آتا اور سوکھے تھے ری بال اس کے منڈپ پر آپ رہتے اور سیندھ ڈھیلا پا سجھا مر جو س نے آج، ہی مدد تھا کھڑ بڑ کھڑ بڑ کرنے لگتا۔ ہولے کے ایک تیز جھونکے سے اس کی آنکھوں میں اور آنکھوں کے ساتھ ذہن میں ایک بھلی سی کونڈی اس نے نیچے کھڑے کھڑے آواز لگائی۔ "تجیذ ننگی ہا منٹی توڑتے توڑتے تجیذ کے ہاتھ زک کے گئے۔ پاؤں اس کے آک درا کاپنے، پھر وہ سنبھالی، اور آہستہ سے نیچے اٹتا آئی۔ زہان سے چپ، منہ سو جھا ہوا، یوری تمنی ہوئی، آنکھوں میں انگارے، وہ اسے دیکھ کے سمی گیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اور وہ کھڑا کا کھڑا ارہ گیا، ہاتھ پاؤں نسل اول الہر سے بٹھا جائے۔ وہ اس کے باخل پاس آگئی اور اس کی ڈر کے مارے بری حالت مگر عقدہ بھری آنکھوں سے ایک ساتھ آنسو نکل پڑے۔ تجیذ بچکیاں لے کر رونے لگی۔ پھر دھرمی اور بھکیاں بھی ہوئی کھڑ کی مرٹ میں پڑی۔ پاؤں سو سو من کے اور جی میٹھا جائے۔ کنوں میں پہ بہت دیر بے سدد کھڑا رہا۔ پافی سے بھری چرس اور آئی، میرا سے زور لگاتے ہوئے اپنے پیروں کے قریب لاتا اور پوری آواز سے گاتا۔

ہو جی گنگا جنم اسرائی سات سندھو بھرلو

سیندھ بے زندگی اس کے پہنچے ہوئے سیندھ پیروں پہ بکھڑا، پھر کنڈھی میں کنڈھی سے بکھنی کنڈھی نالی میں بہتنا چلا جاتا۔ وہ کھڑا رہا کھڑا رہا، پھر آپ ہی آپ چل پڑا۔ کھڑ کے دروازے پہ پہنچ کے وہ تھنکا۔ سونچ میں پڑ گیا، اس سوچ میں کہ اندر کیسے جائے۔ ڈرتے ڈرتے ڈیلوڑھی میں قدم رکھا، پھاٹکتے گزر کے دبے پاؤں دو بائی میں پہنچا اور اندر کے دروازے کی دراز سے اندر جا کنکن لکھا، انظر تو کچھ نہ آیا مہاں (با میاں کے چلانے کی آواز کا نوں میں آکر ہی محتی، شاید تجیذ نے ابا میاں سے کہ دیا، اور اس کا دل اندر سے دھکڑ پکڑ کرنے لگا۔ جلدی سے باہر نکلا اور اسے پاؤں کلی میں مہندر کے پاس پہنچ کر اس

نے ابھی پڑ کے دیکھا۔ کوئی آرہ تھا، دل کو ڈھارس ہوتی اور قدما ہٹتے پڑتے نہ لگے۔ پانی کے ایک
نہیں سے تھا لے پر اپک بھینیری جانے کب سے متعلق پھر کرنی سی گھوسمے جا رہی تھی۔ دھوپ ڈھل رہی
تھی، مگر پنہار نہیں کنوئیں پہا بھی نہیں آئی تھیں۔ ہاں کھڑکی کی خاموش چرخی جاگ، تھی تھی چکتی رکتی
رہ دی یونچے اتر نے ملگی دُوری لمبی ہوتی گئی اور گڑ دی یونچے اتر قیچلی گئی۔ یہاں تک کہ کنوئیں کے
در چنکا کا ہوا، اور لمبی دُوری سمجھتے لگی، اکھڑکی کے اندر ہیرے میں گم ہونے لگی اور پھر وہ سفید پچتے
ہوتی برساتی سمنے سی گڑ دی بھی اندر ہیری کھڑکی میں گم ہو گئی۔ اس کی حیرت پھر جگنے لگی تھی، خاموش
چرخی کو وہ دیرتاک تکارا، اس بھید بھری کھڑکی کی گھنی کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہ کر ایک بر
نے اس کا دھیان بیٹھ کر یا جواس کے ہاتھ کے ہتھی سے پرے ہٹ گئی اور پھر اسی پانی کے نہجے منہ
تھا لے پہ جائی ہی جہاں کئی چلی چلی تریں اور بیٹھی تھیں انہیں دیکھ کے اسے اپنی کھنڈاں کی قمی یاد
آئی جسے وہ وہیں کھنڈاں کے درخت کے یونچے پھینک آیا تھا اور جواس وقت ہوئی تو ان
ساری بڑوں کو شکھوا لیتا۔ اسے پھر ساری بات یاد آگئی اور بھی ڈھینے لگا وہ اُس اُس پھر
چلنے لگا۔ پیادہ کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے پیاس لگنے لگی۔ اوک سے پانی پیا کہ کھاری
تو نہیں پھپکا پھپکا صردار کا اور نشاید ایسا تھنڈا بھی نہیں تھا۔ پیاس سمجھ کر بھی بے بھجی رہی۔
پیا وکی گلی سے سڑک پہ چلا آیا جہاں دھرپ ڈھلتے پہ کئی چاٹ والے آبیٹھے تھے۔ ایک میلا کھشا
لہاس طرف بھوکی نظر میں جمنے کھڑا تھا کہ کوئی کاہک۔ وہی رہتے کھا کے پیا پھینکتا تو پہک
کے آتا اور جائنا شروع کر دیتا۔

باز اسکی جن جاتی بوجھی دکانوں پر وہ کھنڈوں بے مقصد دبر دیرتاک سوق سے کھڑا رہتا اور
بھجی دس سروں والے راؤں کی تصویر اور بھجی دہنسر دہنسر جلی ہوئی لئکا کے اور یہ سے اڑتے ہوئے
ہنومان جی کی تصویر کو تکارہتا اور بھجی اس سوچ میں پڑھ جاتا کہ یہ کالا سانپ کہ گردن ہیں البتہ
رہیے سر پہنچن پھلانے کھڑا ہے۔ شو جھی کے چنکا کر کیوں نہیں مارتا، ان میں سے ہر دکان پر لیا
ٹھڑا ہوا، کھڑا رہا اور بے نارہو کر آگے بڑھ گیا۔ آخر دکانوں کے چڑاغوں میں بھی پڑی،

یہ پا اور لائیں جلنے لگیں اور وہ بھر کھڑی طرف چلنے لگا۔

”کون؟ صمیر؟ اندر ہی سے میں کھڑا اب تھے؟ کیوں، کہاں تھا اب تک؟“

بینے میں اندھا ہوا غبار کے اور آنکھوں کی راہ اندھر پڑا اور اب ایسا سارا خصہ بھول جاتا ہے میں سے رکا اسے اندر لے گئے۔

اب ایسا اُسے یاد تھے، اب ایسا کی بائیں یاد تھیں، اگرچہ بھری بھری سی، انہل بے جوڑ انداز میں بھوڑا چکلا ڈھلتا ہوا بھر لوں دار گورا گورا بدلن، سفید ہلکی ہلکی ڈاٹھی، اس پر بلکہ سے بمال کر قدم سے جملی ہوئی، بر میں اجلا سبید محل کا کڑنا لگے میں لٹکی ہوئی چاندی کی خضی سی نلوار جس سے دلوں وقت کھانے کے بعد خلاں کرتے، حصہ پیتے پیتے اونگھنے لگے میں رحتے کی نے ہوٹوں سے الگ کی، چاندی نیچے تخت پر سمجھے جو میے گا وہ تکیے پر کرنپچھے کو گھسکی اور سفید برف سرٹکی، نڑاٹتے لینے لگے۔ ابھی خراٹے رہے ہیں اور ابھی خراٹے لیتے لیتے چونکے ہیں اور زمہر کی نماز کے لئے رسیدے مسجد کو، محراب پر قرینسے اور پر نیچے جھی ہوئی سرخ اور سرمنی چلیں گے بعض شوق سے خریدی گئی تھیں اور بعض تھیں میں آئیں اور کسی کاپ سہری کسی پر روپہلی باریک نفسی جاتی کھدی ہوئی، صحاری جالر والا پنکھا کا اور بھنی ڈاٹ والی چھت کے کندوں میں آور زان دوپھری بھر حرکت میں رہتا اور بیٹھ کے گوشے گوشے میں ہوا پہنچانا بہت سیل کا چمکتا ہوا الالان کو نے میں رکھی ہوئی لام کی شکل کی بھری، لمبا چوڑا تخت کہ چاندی اس پر بچھی ہتی۔ چاندی پر قالین اور گلا و تکیہ، اب ایسا سارا دن اسی تخت پر نیٹھے رہتے، آنے والے رہتے، مونڈھوں پر بیٹھتے، تھے پیتے، پان کھاتے، بائیں کرتے، اور پلے جاتے۔ بیٹھ ک بھر خالی رہ جاتی اور اب ایسا اونگھنے لگتے، میر، تھیڈن کہاں ہو، وہ اور تھیڈن دونوں بھائیوں بھائیوں کے آتے اور اب ایسا سے پشت جاتے، روزاکنی جو دیتے تھے وہ۔ مگر دوپھر کو ان کی پکار کر فشار نی کا بسیام بن کر آتی، باہر بول پڑی ہے، سو جاؤ، ایک بغل میں تھیڈن دوسری بغل میں فھٹا، پچ میں، اب ایسا، انہوں نے خراٹے لینے نظر دع کئے اور تھیڈن نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا اس نے تھیڈن کو میرے

کے ائمہ کے اتنے میں خرااؤں کا تسلسل ٹوٹتا رہا جاتے ہو، لیتے رہو، اور وہ دلوں پھردم سادھے کرائیں پڑھ کر بیٹ جاتے، لیتے رہتے لیتے رہتے کہ اتنے میں گلی میں ملائی کے برف والا گھنٹی بجاتا، لی کا بڑیف، کی صدای کامانا اور وہ بے اختیار اب ایسا کے پاس سے اچھیلیکے دوڑنے گلی س پہنچتے۔ اپنی اپنی اکتنی نیفے سے نکال، ملائی کا برف خرینا کہ چاقوے کی ہوئی سفید برف قاشیں ہرے ہرے پتوں پہنچتی چلی جائیں اور بھرائی انگلیوں کے میں سے پہنچتی چلی جاتیں برف بخت ہو جاتا تو انگلیوں کا واسطہ ختم ہو جاتا اور برف سے ستبے اور زبان میں بے داسطہ نہتے پہنچا ہو جاتا۔ پھر گلی انگلیوں کو دامن سے پہنچتے اور اب ایسا کے خیال سے ڈرتے سختے ہوئے ہوئے اندر آتے، اتنے میں دالاں کے کسی در سے بڑیا آہستہ سے نکل کر رنگتی، ہوئی اور پہاڑتی عر آفی ہے بڑیا، اور دونوں کے دونوں تیر کی طرح زینے میں ہو چھت پہنچتے۔ تھیسند بڑیا پکڑ لیتی در منڈیر پر کھڑے ہو بڑیا کوچکی میں پکڑ فضایں بلند کرتے ہوئے پیغام دیتی «بڑیا بڑیا اللہ یا میں سے میرا سلام کہیو؟» اور میرا بخی، وہ بے تابی سے بول اُھتنا۔

دنیسر اکیوں، بڑیا بیمری ہے بڑیا بڑیا اللہ یا میں سے تھیسند کا سلام کہیو، اور چکلی کھلتی، اور بڑیا، شیبد کا لا جھالا، بڑا کے جھونکے کے سانکھا اور پہنچتی اور اپنی چلی جاتی۔ وہ روذہ روذہ ہو جاتا اور تھیسند سے اس کا دل پھر جاتا۔ اداس اداس ساری چھت پہ بھٹکتا پھر تلا کبھی اس نہیں پر کے پاس کبھی اس نمی کے قریب، کبھی سوکھی مزدھگاں والے بوسیدہ ہمچھ پکبھی اس بڑے کھڑے بس کے راستے بر سات کے دونوں میں چھت کا سارا پانی سکٹ کر دیوار سے نکلے ہوئے ہیں کے دوڑے بہت نالے میں جاتا اور دھاڑ دھاڑ گلی میں گرتا اور مالیوں ہو کر وہ بیچے اترنے لگتا، اتنے بیس بندروں کے طفیل لوٹی ہوئی نمی میں ایک نخنی سی بڑیا میرا سلام اللہ یا میں سے ہے زور سے ہیزنا۔ پھر وہ بھی اسی منڈیر پر کھڑا ہو پیغام دیتا «بڑیا میرا سلام اللہ یا میں سے کہیو، تھیسند کس حضرت سے بڑیا کو دکھتی، بڑیا کہ اس کی چمکی سے نکل دھوپ سے پلٹی فضایں تیز نے لگتی، زیگتی رہتی رہتی رہتی اور تھیسند لہک کر کھتی میری بڑیا تھکلی ہوئی ہے اللہ یا میں

کے پاس کیے پہنچے گی۔ لوچی وہ تو نیچے آرٹی ہے، وہ بھر رونا سا ہو جاتا کہ اتنے میں ہوا کا ایک درور کا جھونکا آتا اور بڑیا نیچے کتے آتے اٹھتی اور تیزی سے بلند یوں پہ بھتی چلی جاتی۔ اللہ تعالیٰ کو سلام لے جانے کے سوال پر ان میں عیشہ لڑائی ہوئی میری ماں تو ایک ہی کا سلام میں جا سکتی تھی تاہم اور تجھیسہ ایسی مطلبی کہ بس اپنا سلام اللہ تعالیٰ کو بھتی ہاں سینگی بائی کی جادو بھری آواز در سے آتی تو دل ان کے ساتھ ساتھ دھڑکتے اور سہمی آنکھیں اپس میں ایک ہی کمانی کھیتیں۔ مارے ڈر کے نیچے منڈیر کے، دیوار سے زینے کی لگے دبکے دبکائے بیٹھتے رہتے اور اتنے پاس پاس ہو جلتے کہ دھڑکن ایک دوسرے کے دل کی صاف سنائی دیتی بیٹھتے رہتے بیٹھتے رہتے، پھر چکے چکے سرخکال کر گلی میں جانکئے کہ سینگی بائی ہے یا گھر چلی گئی۔ بڑیا ہمگی میں بھٹکتی ہوئی بڑیا کو دیکھ کے یک بارگی چونکہ اور سینگی بائی کو مجھوں بحال واقعی تیر کے زدنے سے خل آنگ میں، آنگن سے گلی میں پر بڑیا گاغا ٹب کھاں گئی، چھوڑ ہو گئی اور وہ بڑیوں کی تلاش میں ایک سبھے اور خطرناک سفر پہل کھڑے ہوتے، ہجور کی طرف بھماں گھکے پودے کھڑے تھے کہ ان کے ہر سے کچھ کچھ بھلوں کو توڑنے پہ سفید سفید دودھ نکلتا اور جب پک کر آپ پھٹتے تو اندر ان کے باریک سفید ریشم کے تار سے نہ ہوتے، چیل میدان کر چکتے چلتے کوئی شبیث نہ ہوئے میں چھ جانا اور حون نکلنے لگتا یا گوکھر و چھ جاتے اور نکلنے کے نکلنے، کہیں بد زنگ کا نئے دار جھاڑی، کوئی آڑا تر چھا اکیلا بول کا پر بڑی کالی چھتی خار سرخ والنوں والی جھاڑیاں اور پر سے ان کے ایک طرف نکنڈاں کا ایک بہرا بھرا پیرا ایک اوپنچا پیپل اور کئی ایک گھنٹے نیم یہ گتھے ہوئے کہ نیچے ان کے دھوپ کا نشان تک مہوتا ان درختوں کے قریب پہنچنے پر سفر کی منزل اکثر بدی ہے اور بڑیوں سے ذہن گرگٹ کی طرف منتقل ہوا ہے۔ ان درختوں میں جانے لکھنے گرگٹ چھے تھے کہ دوپھری میں روز ایک آدھ گرگٹ کا بھرتا ہونا اور دوسرے دن آتے تو بھر نیم کے کسی گردے پر نکنڈاں کی کسی ہٹنی میں کبھی سرخ سرخ منہ نظر آتا کبھی پیلی پیلی لمبی دم کنڈاں کی لمبی لمبی ہری نیٹوں سے اور ایٹھوں سے گرگٹ اور کے حضرت عباس کی شکر میں جھیکرنے کا

بدارینا اور ایک بیل خول پڑھانا اور بھر اس سے پرے چلتے ہوئے کنوئیں پہا تھے من وہ نہیں
پہنچو بھر پانی پینا اور کندھی کے ٹھنڈے مو تیا پانی میں پراؤال دبنا۔ پانی سے بمالب بھری
ہوئی کالی چرس جب کنارے پہ آجائی تو گورا چاکڑیں جوان ہیرا رے کوزد سے لکھنچتا اور ان گلائے
ہو جی گنلا جھنا سروتی سات سنہ ہو بھر لوپہ

اور اس کے قدموں میں ان گنت ٹھنڈے میال بچوں بکھر جلتے۔ کامے ٹھنڈوں سے اوچی میلی
دھوتی اور مونٹوں سے بچے تک لکھتی ہوئی کچھ سی کچھ طری موچھوں والا گندل بیلوں کا رسکھوتا،
”تیرا بیل کامنہ ہو“، اور اس کے ساتھ ہنڑ پڑھنے کی سڑاک سی آواز جس کے اثر سے ایسے
ہوئے بیل بھرا اور چھائی کی طرف چل پڑتے اور اس نیزی سے کھرمارتے خاک اڑاتے کہ اس
کا دل دھک دھک کرنے لگتا کہ اب وہ اپنے رستے سے ہٹے اور اس کے سر پر آئے افسوس میں
سے ہٹ کر بھر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف ہو لیتے۔ بھر وہی معکرہ گرگٹ۔ گرگٹ سے
وہ ڈرتا بھی تھا اور دھاتی دے جاتا تو مارے بغیر بچوڑتا بھی نہیں تھا بلی بھر خون جو گھٹ
بلائے۔ ماں ایک دفعہ وہ گرگٹ کو نہیں مار سکا تھا، بس ایک دفعہ، مارنا کیا معنی ہا تھا، ہی نہیں اٹھا۔
”گرگٹ“، اس کی آستین پہ تجیسہ کی گرفت سخت ہو گئی اور دونوں کھڑے کے کھڑے
وہ گھنے۔ پیل کی جڑ سے نکل کے وہ تباہ پر صور ہاتھا۔ اس نے ایسٹ اٹھائی، ایسٹ اٹھائی تھی
کہ وہ پڑھتے پڑھتے ایک دم سے رُک گیا: من اس کا نئے سے کوئی ایک انگل اور
سرخ ہوتے انگارے کی مانند دکھنے لگا۔ سرخی اس کی گردان میں، اس کی پیٹھ میں لہریں لینے
لئی اور بچوں کے وہ پیلے سے دگما موٹا ہو گیا تجیسہ کی سمجھی نے اس کی آستین کے ساتھ ساتھ
اس کا بازو بھی انگلیوں میں جکڑا لیا۔ دونوں دل ایک آہنگ ایک رفتار سے دھڑکنے لگے:

دونوں ایک بن گئے: ایکے، کوسوں آدمی نآدم ناد، نآدم ناد کی آواز، پانی کی بھری چرس
کنوئیں میں محلق اور بیل، ڈھلان پہاڑتے تھا زتے دھفعتار کر گئے تھے اور ہیرا اور گندل کنوں
پچھوڑ کر کہیں کم ہو گئے تھے ہر آواز بھر گئی تھی، قدم ان کے دھڑکتے ہوئے دل ان کے،

ہاتھ میں انعامی ہوئی ابیٹ، پیپل کے کہتے کہندہ اُن کی لمبی لمپکسلی شاخیں۔ ایک پیز بس حرکت میں بھی، حرکت میں بھی، لہر اور بھی بھی، سرخی کہ اب بل کھا کے ہری پڑتی جا رہی بھی، امنتنی بل کھائی ہری لہر، گرگٹ جانوگم ہو گیا تھا کہ گھل گیا تھا اور نگ کی لہر بن گی تھا، پیچ کھاتی گرم ہوئی ہری لہر پھر بدلی، زنگ نتے مسری جون فی، ہری لہر بنتی پڑتے لگی: پھر گفتی کا احساس بھی جاتا رہا، کچھ خبر نہ بھی کہ کب کے ٹھہرے ہیں کب تک ٹھہرے رہیں، زنگ کون کون کون سی جون لے چکا ہے اور کون سی جون اور سے گا۔

چونکے تو پیپل کے پتوں میں ایک لمبی پیپلی دم گھومتی ہوئی کم ہورہی بھی۔ دم میں دم آیا اور دل پھر حرکت کرنے لگے، دھڑکنے لگے اور پسینے کی تیلی چلنے لگی۔ قدم کہ جنم گئے بھتے اور آپ ہی آپ کنوں میں کرف اٹھنے لگے، جہاں چڑھس اپنے معمول سے چل رہی بھتی اور ٹھنڈا ٹھنڈا ٹھہرے ہوئے موئیوں جیسا پافی ہیرا کے سفید پیروں پر بہتا ہوا پختہ کندھی میں، پختہ کندھی سے کجھ نالی میں، اور نالی سے کھیتوں میں جا رہا تھا۔ خاموشی سے پافی پیا اور جلدی سے گھر کی طرف چل پڑے، چپ چاپ، کم سڑ۔ دشت اُنکھوں میں باقی بھی! اور دھڑکنا دلوں نے ابھی بند نہیں کیا تھا۔ ہوابند، اور کوہ اور اکھی کی جھاڑیاں کہ جیسے دھوپ میں چھلنے لگی ہیں زمین نے قدم ایک دم سے پھر بکپڑے لئے۔ چار فرماں گے ایک چکر تیزی سے گھومنے لگا تھا، پڑھیں، تھیں نے آتیں اس کی پھر جکڑی۔ چکر تیزی سے گھومتا ہوتا پھیلنے لگا اور آس پاس پڑے ہوئے کاغذ، پنگوں کی نوٹی کمانیاں، امر عینوں اور کبوتروں کے اکا دکا میلے پر، پھر جھوٹی جھوٹی ٹکڑیاں اپنی لپیٹ میں لیتا آگے بڑھنے لگا، پیچ کھانا اور پر اٹھنے لگا۔

وابس گھر پہنچے تو بڑی آپا نے آڑے ہاتھوں لیا، کہا گئے تھے تو، ذرا صورت دیکھو، من مسرخ ہو رہا ہے۔ ڈوبے لوؤں میں مارے بھرے ہیں،

بڑی آپا چلتی رہیں اور وہ دونوں کے دونوں چُب۔ بڑی آپا کہنے کو پھوپھی اصل میں ماں سے زیادہ تھیں بیٹی بھی، پر عینی سے زیادہ اسے جاہتی تھیں۔ نہ لانا دھلانا، رات کو

پاس سلانا۔ با واجب اسے سانچے جملنے لگے تو روٹھیں، خفا ہو میں، غمیں کیں، اُنی کو ڈرا جھلا
لما، پھر کچھ نہ حلی تو روٹھیں۔ با واجبات کے ایسے کچے نکالے کرنے، بامیاں کی باستبد دھیان دیا نہ ڈری آپا
کے لئے نہ پہنچے۔

ہاں بھیجا، تمہاری اولاد ہے تمہیں خوبی رہے۔ یومی نے کہا ہو گا کہ لوندرا چھوپھی کے پاس ہے
کہ بگرد جاؤ سے گھا اسے کے آؤ۔ ہاں جیسا شوق سے رے جاؤ، ہم کون روکنے وے؟

بڑی آپا ناتھی میں، باوانے نہیں الگرا راد بے میں ذرا فرق نہ آیا۔ با دا کرتے دہی تھے
جو جی میں آتی بھتی مگر نہ تھے خاموشی سے۔ بامیاں کے سامنے تو با سکھ ہی چب رہتے انہیں
ذنوں کی ایک تصویر اب تک حافظہ میں اس کے محفوظ بھتی صبح ہی بمحکمہ میں بوک بخون
تھے اور اب امیل کی آواز بار بار غصے سے کاپنے لگئی اور من سرخ پڑ جائی۔ اتنی سورتے لوگوں
ا بھیک میں نبیع ہرنا بھی محیب ساختا۔ کیونکہ اب امیل اتنی سورتے نہ تو بھیک کھونے تھے۔
ادرنہ ملنے والے آتے تھے ہوارات سے بند بھتی رات کو گرمی سے کمی۔ زندہ اُس کی سماں
اور دیکھا کہ بڑی آپا جا گئی ہیں اور سکھا جلتی ہیں۔ صبح بھر بہت سورتے کروں سے اس
کی سکھ کھل گئی۔ سارا آنگن پیلہ پیلہ ہورتا تھا۔ ایک عناء درپواروں پر احمدہ مردیں پہنچتی
ہیں کم کے اوپر عزن سب جگہ تر رہا تھا، ایترتے تیرتے رک نہ تھا۔ بڑی آپا نماز کی چری
ہی تھیں اور اپنی سمجھی دلکھسری اواز میں مناہات پڑھ رہی تھیں۔

مول علی، وکیل علی، بادشاہ علی

صبح کی نماز کے بعد مناہات بڑی آپا کا ورد تھا۔ روز یعنی ہوتا کہ اسکی بھی اس کی ابھی
بند ہیں اور آدھے سوئے اور آدھے جا گئے کی کیفیت ہے اور کا نوں میں جاندی کی کہنے والی
نیچ رہی ہیں۔

مول علی، وکیل علی، بادشاہ علی

بڑی آپا کی آواز میں عجب رقت اور درد کی کیفیت تھی اور مناہات پڑھتے دیکھ کر قل

لہس ابھی سکھیں کی اور سچ کے پاکیزہ و صندک میں محل جائیں گی۔ پیلا پیلا آنکن، ہوا بندرا اور بڑی آپا کی رفت بھری بھٹی آواز ایک ٹھنڈی منور لکیر آنکن کی سیل گرم فضابیں رستے بناتی ہوئی اس کی آنکھیں پھر مند نے لگیں میکن بند ہوا سونے کھا رہتی تھی۔ وہ اجھے بیٹھا۔ بڑی آپا مناجات پڑھتی تھیں، تماں اماں و منوگر ہی تھیں، تحریک بے سرحد پڑھتی خڑلتے یعنی تھی اور بیٹھک سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں اور ہی تھیں جیسے بیٹھے لے اکتا ہے ہوتی ہوئی۔ آنکھیں مٹا چاہیں سے اڑا اور سب سہا پڑھک میں۔

«مُنْ رہے ہو، بنیاد علی، پیر جی کی باتیں»، ابا میں زور زور سے بول رہے تھے۔ ابا پیر جی تم مجھے جھوٹا دال سکتے ہو مگر اخبار کو کیا کر دے گے۔ فائل نکلو اؤں اور دکھاؤں آپ کو اخبار اخبار کے ذکر پر پیر جی تھوڑے سے مٹپٹا نے اور بنیاد علی پر ابا میان کی بات کا سکر جم گیا۔

ابا میان اور نیز ہوئے یہ انتہا تھوڑا ہی ہے اور سینے۔ ابا میان رکے اور پیر جی سے آوازا دیکھ کر کے بولے «پیر جی اور سینے، حضور رسول مقبول کے روشنے کا بھی قبرہ گردادیا، قبرہ گردادیا، بنیاد علی، مولوی شناہ اللہ شیخ ضیاء الحق سب کے بدن میں عنصراً گیا۔

«نہیں صاحب، خیال میں آکتے والی بات نہیں۔»

«نہیں صاحب» ابا میان گرجے «تو اخبار تو مان لو کہ جھوٹا ہوانا؟»

سید کے سب چہب ہو گئے۔

پیر جی بولے «گروایا تو نہیں ہے اترو کے الگ رکھ دیا ہے۔»

ابا میان بولے «تو ہوا کیا کہ عین دوپھر میں ایک بدی اٹھی۔ سارا مدینہ خشک، اور سونے منورہ بیچ چشم پانی برسا کہ گندہ شریف اور صحی اقدس دھل کے گرد سے پاک ہو گئے۔

خطیث سے سب کے سر جگ کے پر پیر جی ناموش مولوی شناہ اللہ کی آنکھوں سے آنسو باہنی ہو گئے تھے۔ باوا الگ ہونتھے پہ چہب پاپ بستھے تھے وہ کل، ہی چھپ پر کئے تھے۔

یہ میں موجود یگن نہ کسی بات کی حمایت نہ مخالفت اور نہ چھر سے پر غصہ نہ عقیدت۔ اپنی اپنی عدالت
بادا اب ایسا کے بر عکس تھے۔

اب ایسا حلقہ پڑتے رہتے، پھر جتنے کو بنیاد علی کی طرف سر کا دیا۔ شیخ جی تم مشفی کر دو۔
وہ پھر بولے «ایسا شخص مسلمان کہلاتے کا مستحق ہے؟»

شیخ بنیاد الحنف فراہب بولے «تو بکرو ایسا شخص اور مسلمان»

«ایسا شخص مسلمان تو نہ ہوانا»

«نہیں، ہرگز نہیں۔»

«اور جو ایسے شخص کی حمایت کرے وہ مسلمان ہوگا؟»

«ہرگز نہیں۔»

«تواب نہ» اب ایسا بولے «تمہارے حضرت رئیس الاحرار نے اسی ابن سعود کی حمایت
کی تھی۔»

«ابن سعود کی؟»

والله ابن سعود کی جو جھوٹ بولتا ہو وہ کافر، اخبار موجود ہے۔ اس میں ان کے قلم کی
تحریریہ تھی ہوئی ہے۔

پیر حجی پھر بولے «رئیس الاحرار کی دلیل یہ تھی.....»

اب مولوی شناور اللہ بولے میر کونڈہب کی بات ہوئی سیاست کے بالے میں جوان
کی رائے تھی اس پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔»

«یحییے صاحب» اب ایسا طرز بہتی ہے میں بنیاد علی کی طرف مخاطب ہوئے
«بنیاد علی سنتے ہو کیا کہہ رہے ہیں شیخ جی..... اماں شیخ جی آپ میں کانگریسی میر اتو
روے سخن ان چار مسلمانوں کی طرف ہے۔»

بنیاد علی نے حلقہ پھر ایسا کی عرف برخاد دیا۔ اب ایسا نے حق کے نئے ہونٹوں پر لی۔

دو تین مکھونٹ لئے، کھلنا شروع کر دیا، پھر مکھونٹ لئے اور آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں بٹ ہونے لگیں۔

«خیر جیسا کیا وہ ان کے ساتھ۔ اب وہ اس دنیا سے اُنھیں لگے اللہ ان کے گناہوں کو معاف کرے۔» بنیاد علی ٹھنڈا سانس بھر کے بوئے۔

ابامیال کی آنکھیں اسی مرح بند تھیں اور حلقہ بدستور گر گر رہا تھا۔

«دیکے یہ خبر صحیح بھی ہے؟» مولوی شناہ اللہ نے تک بھرے لمحے میں سوال کیا۔

«صاحبِ شناہ ہے اللہ جلنے،» بنیاد علی نے جواب دیا۔

«اخبار میں تو ابھی کچھ آیا نہیں ہے۔ کیا کہا جاسکتا ہے؟» پیر جی بوسے۔

ابامیال ٹھنڈا رہتے کرنے کے لئے کو الگ کیا، کھنٹ لگے «آج کی خبر ہے تو اخبار یاں کلہیتے گا۔» انہوں نے ختنے کی فہرمند میں لے لی اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

«فدا کرے جھوٹ ہو،» شیخ صنیاء الحق بوسے۔ باہر ٹرک پاک دباد باس اپنگا مر پیدا ہوا اور بہت سے قدموں کی درمیان پاپ۔

«کیوں بھی کہا جلوس ہے یہ؟» ایک شخص پلٹتے چلتے بیخ مرک پر بیٹھ گیا۔

«جلوس؟» بیٹھک میں سب کے سب چونک پڑے جلوس چلتے چلتے بیٹھک کے سامنے آگئا۔ کالا علم آگئے آگئے، پیچھے ایک جمع، کھدر پوش کا انگریسی رضاکار، ترکی ٹوپی اور شیر و دنیا پہنے ہوئے مسلم شرفاء شیخ صنیاء الحق، پیر جی، بنیاد علی، مولوی شناہ اللہ سب کے سب اندر سے باہر چوتھے پر آئے، پھر پیچے اتر کے جلوس میں شامل ہو گئے۔

ابامیال آہستہ سے اٹھا اور چوتھے پر آکھڑتے ہوئے۔ باوان کے پیچے پیچے جلوس جب بیٹھک کے آگئے سے گزر گیا تو ابامیال کے قدم شاید بے ارادہ اُنھیں اور آہستہ سے نیچے اتر کروہ بھی جلوس کے پیچے پیچے ہو لئے۔ باوان کے ساتھ تھے اور وہ بھی ان کے سامنے لگ لیا تھا۔

فیقر چند پر جو نیا سودا تو لئے دکان سے اٹھا اور تینچے آنکھڑا ہوا «میاں کیا ہوا،»
«مولانا محمد علی...»

«محمد علی شوکت علی؟»

«میاں محمد علی شوکت علی۔ لاالرجحی دکان بند کر دو،»

«لالرجحی، کیا ہوا، گھٹنا ہو گئی؟»

«بھیجے، محمد علی شوکت علی کا دیہماست ہو گیا،» فیقر چند نے دکان کو نالا گایا اور پک
چپک آگے بڑھ جلوس میں مل گیا۔

«محمد علی شوکت علی خلافت ولے؟»

«کیا کہا؟ خلافت والے محمد علی شوکت علی گور رکھے؟»

دکانیں بند ہرنے لگیں کسی نے دکان بند کر چھڑے پہ بیٹھ جانا مناسب جانا، کوئی جلوس
میں جاملا۔ خاموش جلوس سرٹکوں اور گلبوں سے نکلا ہوا ٹھیکروں والی گلی میں پہنچا، وہاں سے
کل کر بڑے بازار میں، بازار بیٹھ کے بیدان میں آیا اور رک گیا۔

«حضرت مجید جلیلے،» ایک شخص بلند آوانی سے بولا۔ اور جمع برڈی خاموشی سے میدان میں
پچھے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا۔ پھر محمد آگے بڑھا اور چادڑ پکھے ہوئے تخت پر جا پہنچا۔ کانگریس
کے ہر جلوس میں محمد کھدر کالمبایکر تھے پہنچنے جنک رکائے بال بڑھائے آگے آگے ہوتا تھا۔ کبھی کبھار
کئی نیزیں کے لئے غائب ہو جاتا اور جلوس میں بال محل دھائی نہ دیتا، پتہ چلتا کہ جیل چلا گیا اور
پھر کسی دن یہ کایا جلوس میں سب سے آگے جھنڈا لئے نظر آتا اور زور دوسرے نظرے رکاتا،
بلکہ پھاڑ کے تقریر کرتا۔ آج اس نے کوئی نعروہ نہیں رکایا تھا۔ وہ تخت پر پھر ا ہوا۔ جمع خاموش تھا۔
نیکو وہ چپ کھڑا رہا، پھر بلند آواز سے بولا «بھائیو، ہم وطن، آج رہیں الاحرار...» بہاس
کی آواز پھر گئی۔ چب ہوا۔ گلا صاف کیا، پھر بھولا «بھائیو، آج...»، آواز پھر پھر انے لگی،
پھر خاموش ہو گیا۔ جمع برستور خاموش تھا بہت سے لوگ اس کی طرف نکل رہے تھے بہت

مول کے سر جبکے کئے تھے۔ بعض لوگوں نے پہلے چکے رونا شر فرع کر دیا تھا۔ ایک شخص نے پانی کا گلاس صمد کو کپڑا دیا۔ صمد نے پانی پیا، رومال سے منہ پوچھا، پھر اعتماد سے گھنکار کر بولا۔ «بم وطنور نیس لا حرار نے فرایا تھا کہ میں آزادی نے بغیر اپنے لئے واپس نہیں جاؤ گا۔» صمد چپ ہوا، پھر ایک ساتھ رفت بھری آواز میں چلا کر بولا۔ «تو مسلمانوں نے نیس لا حرار واپس نہیں آئے۔ وہ ہمیں... ہمیں وہ چھوڑ گئے۔» صمد کی آواز بھر اگئی اور وہ شیخ سے یہی نیچے انزگیا۔ جمع اسی طرح جما بیٹھا تھا، خاموش، سر جبکے ہوتے، کسی کسی آنکھ سے آنسو بنتے ہوئے۔ اس نے اب اسیا کو دیکھا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ باوا چب کھڑے تھے۔

(۲)

ماضی اس کے نیس خوشبو تھی کہ اڑر ہی تھی، بھرت کر رہی تھی طبی راتوں اور کھڑی دوپہر لوں کا وہ بے انت سلسلہ اب ایک اونچ بسا خواب تھا۔ آنکن والا نیم کا پیر، اونچی نیچی چوڑی چیتیں، کاہی جھی منڈریں اور اونچی دیواریں، سب سے اوپر کوئی تھے والی وہ منڈر جسے بندروں نے آؤ ہالوڑا لائی تھا، پرے نظر آتا ہوا الی مندر، لال مندر سے بہت پرے کھڑا ہوئے۔ موٹا مکھس پیچ، پیچ میں نیم اور پیپل اور شیشم کے درخت کھڑے ہوئے، سب چیزوں ویسے ہی ہوتے ہوئے ویسے ہی نہیں تھیں۔ اس سے وہ سب کی سب کتنی دور ہو گئی تھیں، ملنا تھا کہ روسرے جنم میں ان سے مل رہا ہے۔ حالوں بعد وہ واپس آیا تھا۔ کیا بھر ہے کہ ابھی اور کب تک وہ واپس نہ آتا، مگر اب اسیا کی بیماری کا تاریخ بخواہ اور باوانے جلدی جلدی بچھی لیں۔ اسی نے سفر کا سامان تیار کیا اور چل کھڑے ہوئے۔ مگر سفر گھنٹوں کا تو نہیں تھا، دنوں کا تھا۔ سو بے سے محبوبے میں یوں تو نہیں بہنچ جاتے۔ گاڑی دن بھر چلتی۔ رات بھر چلتی، رچلتے چلتے کھڑی ہو جاتی، پھر چلنے لگتی۔ رات کے اندر بھرے میں کبھی کسی سیمیش کے قریب بھی بچ جگلی میں

نی ہو جاتی اور سبھی دینے لگتی، کبھی کبھی اتنی کھڑی ہوتی کہ سافر اکتا کر گاڑی کے نیچے اتر جاتے۔ اُولیوں کی ٹولیاں پڑیوں کے بیچ میں بچھے لکھر دل کو روندی ہوئی جمل قدی کرنے لگتیں، ادا بدستے بکھر کی سے جھانک کے دیکھتے اور بالآخر نیچے از کر کسی چکر سے پوچھ گچھے کرنے لگتے۔ اتنے میں دوسری پر روشنی کا ایک منڈ ادھاری دینا، یو قریب آئنے پر اتنا تیز ہوتا کہ کالوں کے پردے پھٹنے لگتے، مگر جب سافروں سے بھرے ہوئے روشن ڈبے ساکن ڈبوں کے برابرے ہر قسم کے گزرتے ہوئے الہ صیرے میں کھو جاتے تو وہ شور بھی دور ہوتا، مگر ہوتا چلا جاتا، مگر ہوتی ہر ٹی میں جھٹکا لگتا، سارے ڈبے ہل اُٹھتے ہلکڑی پھر چل پڑتی۔

سفر میں افی نے کسی بار اپنی انگلی اُنگلی کے پھر کرنے کا ذکر بری کر مندی سے کیا مفرکے پسروں سے دلن صحیح کو انہوں نے چلتی گاڑی سے سامنے کچے رستے پر ایک پیل کو مر اپڑا دیکھا، بے ساختہ منہ سے نکلا۔ الہی خیر! پھر گاڑی رک کے کھڑی ہو گئی۔ پس اس کے بعد تو ان کا سارا سفر ہی تشویش میں کئا۔

باقانے چلنے میں بہت جلدی کی تھی مگر باہمیاں نے ان سے زیادہ جلدی کی۔ پہنچے ہیں۔ آؤ جانکہ ہو چکا تھا۔ بڑی آپا باوا سے مل کے بہت روئیں۔ روئیں، ہیں کئے اور عین میں باہمیاں کی طرف سے نہ کامیابیں کیں کہ مرتبے وقت باپ کو بانی نہیں بلایا۔ کبھی شکایت، کبھی معذ، کبھی باہمیاں کے انتظار کاؤ کر، کبھی اپنی لگجھا سڑ کا تذکرہ۔

آخری وقت تک دروازے پر ٹکٹکی بند ہی رہی۔ اب آؤ، اب آؤ۔ مبارکاً پوچھتے، چھوٹوں ہلکڑی دیکھنے کسی کو بھیجا ہے۔ بڑی حسرت تھی کہ جیتے کی صورت دیکھ لیں۔ بڑی آیائی آوارہ پچھر جرا نی، اور باوا کی انگلیں پھر غم ہو گیں۔ رات کو جب وہ آکر اتے ہیں تو تڑ کا ہو رہا تھا۔ شری آپا باوا کے گھے میں باہیں ڈال کے اور اتے کے سر سے سر جوڑ کر جانے کب نک روتی رہیں اس کی تو چار پانی پہ کر گاتے ہی پڑ سے آنکھ لگکر بھی تھی۔ اب صحیح نہ ہتے پہ اسے رکا کہ رات کا وہ سلسلہ اب تک جاری ہے، میں اب اک ھٹھڑو کے ساتھ بڑی آپا روئے روتے چب ہو۔

جاتیں، باتیں کرنے لگتیں، ان کے لئے میں سروطہ چلنے لگتا۔ پھر جائے گیا ہوتا کہ انہیں اب ایساں کی کوئی بات یاد آجائی، آنکھیں ڈینے بانے لگتیں، آواز زندھ جاتی اور قدر سے اوپنجی آواز سے رونا شروع کر دیتیں۔ باواچیپ تھے، اماں بارہا رانکھے ضرور نہ ہو جاتی تھی، سر جبک جانا تھا۔ آخری وقت میں اب ایساں کی صورت نہ رکھنے اور خدمت نہ کرنے کا غم، پھر برڑی آپا کے میں بھرے طعنے، باواکا سر جبک جانا اور جیب سے روپال نکل کر آنکھوں پر پہنچ جانکر برڑی آپا کی آنکھوں کی طرح ان کی آنکھیں سوچھی ہوئی تو انہیں تھیں مگر سرخ پڑ گئی تھیں۔

”بس ایک تمنا رہ گئی بی بی کہ بیٹا کہ کاندھا دے باقی تو خدا سختے اللہ نے ساری تمنائیں پوری کیں، تانی اماں کے لمحے میں تاسف کی کیفیت کے ساتھ ساتھ دلا سادی نے کامداز بھی تھا۔ اللہ، اولاد کو سب کچھ قابل بنائے دیسی سکھ کی نیمنہ اللہ ہر کسی کو فصیب کرے“ تانی اماں کو جانے کیا دھیان آیا کہ بولتے بولتے چپ ہو گئیں، ان کی آنکھیں خلامیں گھورنے لگی تھیں۔ چب بیٹھے بیٹھے آہستہ سے چونکیں، بلوکیں بی بی بالکل ایسا لگے تھا کہ سورتے ہیں۔ جانو بھی آنکھ لگی ہے اور ذرا کھٹکا ہوا تو چونک کے آنکھ کھول دیں گے۔“

بڑی آپ تانی اماں کا منہ تکنے لگیں۔ پھر کیمیں اور جا پہنچیں ”پوچھنے لگے کیا دن ہے میں بولی بھرات۔ پامنی تھیں بھی تھی، اسے تکنے لگے۔ بولے نادِ علی پڑھو میں نادِ علی پڑھنے لگی۔ ... ایک ساتھ آنکھیں کھول دیں اور دروازے کر تکنے لگے ... جیسے کوئی دروازے پر کھڑا ہو۔ ... کھنے لگے چھموں ... مولا آئے ہیں ... پھر آنکھیں مند تی چلی گئیں ... سب چبے اپنی اپنی جگہ بستے ہوئے، کسی دھیان میں ڈوبے ہوئے۔ وہ پھر برڑی آپا کو تکنے لگا تھا، جن کی آواز اب کی بارخلاف معمول بالکل نہیں بھرا تھی۔

”آخری وقت میں مولا مشکل کث آوے ہیں۔“ تانی اماں کی دھیان میں ڈوبی ہوئی آواز سرگوشی جیسی کیفیت کے ساتھ اُبھری اور ڈوب گئی۔ پھر وہی چب آنکھ کی ہر چیز سکت تھی، دھوپ بھی کہ نہ کے نیچے پڑی ہوئی چا۔ تانی کی پامنی پر آکر رک گئی تھی۔

نیم کی کسی خاموشی مٹھی سے کوئی نخا ساز ردی مائل سفید پھول بھڑتا اور آہستہ سے کسی گود میں، کسی شانے پر، کسی سریں آپڑتا۔ نخنے نخنے ندی مائل سفید پھول خاموشی سے بھڑتے ہے تھے اور بکھر رہے تھے، بڑی آپا کے گھنٹے پر رکھے ہوئے سوکھے سریں، تائی آماں کے سفید رفتالوں اور انی کی بھڑتی چٹیاں، پانڈاں پر، چار پانی پر، چار پانی کے برابر ہنی ہوئی بھڑاونچی اور اس پر رکھے ہوئے کوئے سرخ بھڑوں پر۔

جانے کیسے مگر بھڑوی ذکر چل نکلا، مگر اس مرتبہ سرگوشیوں میں تائی آماں کی آذاناتی آہستہ ہوتی کہ اسے کچھ سنائی نہ دیتا کہ کیا کہہ رہی ہیں، لیس ہونت ہے تو اور ٹولا سی آنکھیں حیرت سے گردش کرتی، درباتیں کرتی دھانی دیں اور بڑی آپا کے ہاتھ میں چلتا ہوا سروہر کب بارگی رک جاتا۔

«اچھی بڑی آپا میرا تو دل دھک سے رہ گیا۔» اسی کی آواز سرگوشی کی حد سے نکل کر ذرا بلند ہو چلی ہتھی «میں نے تمہارے بھانی سے کہا۔ انہوں نے بھڑک دیا کہ تمہارا وسوسہ ہے۔ آبادی قرب ہے، کسی کسان لا بیل ہو گا، مگر آپا میرا دل اندر سے دھکہ پکڑ کرے۔»... لشکاری یعنی جنگ میں کیوں رکی اور اس پاس کوئی کھیت نہیں کوئی کاؤں نہیں، بیل کس کا ہے۔»

«اری بہنوں، اب بڑی آپا کے لمحے میں آواز بلند ہوتے ہوئے بھی سرگوشی کی کیفیت تھی اور آنکھوں میں حیرانی» میں نے تو بہنوں اتنی دن پہلے خواب دیکھ لیا تھا۔ یہاں دیکھوں ہوں کہ بیان میں آواز دے رہے ہیں، چھپوں، چھپوں، میں حالان سے نکلی ہوئی۔ پہشت ان کی سیری ہرف، باہر دروازے کی ہرف جا رہے ہیں۔ میں بولی ہوں کہ، ابا میاں ولوں میں آپ کہاں جائے ہیں، کہہ رہتے ہیں بی بی، لوں کہاں، دن ڈھل را ہے، اذان ہو رہی ہے، نماز کو جاتا ہوں، دروازہ اندھے سے بند کر لو۔»

پھر بکھر کے سب چپ تھے، اسی ہڑح اپنی اپنی جگہ بننے ہوئے ہیں، کسی دور کے دھیان میں ڈوبے ہوئے: نیم کی ٹھیکانے لدم بھر پہلے ہوا سے لہر اہمیتیں سر گلوں ہو گئی تھیں

اور نجف نہ دی ماں سعید مچھوں کے گرنے کی رفتار پھر اتنی سست پڑ گئی کہ جانو فضا میں رینگتے ہوئے نیچے آ رہے ہیں۔

تائی ماں کو حرکت ہوئی تو بہ توبہ بڑی گرمی ہے۔ ہوا بالکل رک گئی۔ اور انہوں نے زور زور سے نیکھا کرنا شروع کر دیا۔

بڑی آپا چونکیں۔ انہیں یاد آیا کہ باوا کو نہا ہا ہے و تھیں، اری تھیں۔ لبی ذرا غسل خانے میں تو لیہ صabalوں رکھ دے اور دیکھ کر کسے میں پانی ہے؟“

بڑی آپا کو باتیں کرتے کرتے کسی بھی بات پر اب ایسا یاد آ جاتے، ان کی بات کا خیال آ جاتا، اسکے بھر آتی۔ شروع میں یلمے جلدی جلدی آتے، پھر و قفسہ میے ہونے لگے، لمحہ دار سے آتے اور جلدی رخصت ہو جاتے۔ سوگ کی فضائیلی سے رخصت ہو چلی تھی اور روزمرہ کے ذکر اذکار شروع تھے۔ اب ایسا کی یاد کم ہونے لگی اور بڑی آپا کی توجہ کام کرنے باوا بننے لگے پھر ای تھیں کہ بہت دنوں کے بعد ملی تھیں اور سینکڑوں ذکر ان سے کرنے کے تھے، فروری بھی اور عینہ ضروری بھی۔ پھر وہ اسے دیکھتیں اور انہیں خیال آئا کہ شادی اس کی کب ہوگی۔

”ماشاد اللہ، جوان ہو گیا ہے اور اب تعلیم سے بھی فراغت ہو گئی۔ سمجھو، بعد تم میں بیا

کر دواب۔“

انی جواب دیتیں ”بڑی آپا تمہارے سے بھائی کھتے ہیں کہ ہم نوٹسے کی منشا کے بغیر شاری نہیں کر دیں گے زندگی روشنی کے لونڈے ہیں، ماں باپوں کی پسند سے ان کی پسند نہیں ملتی۔ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ بعضی خود پسند کر دیں، ہم شادی کر دیں گے۔“

”کیوں صمیر بیٹا، تمہیں کبھی دہن پسند ہے؟“ بڑی آپا کا رخ اس کی سرف ہو جاتا۔

”تائی ماں بول اٹھیں“ اجی تمہیں ن بتا دے گا وہ تجھے بتا دے گا۔ بیٹا سیرے کا ان میں

بتا دے، جیسی دہن کھوے گا ویسی ہی ڈھونڈ کے لا دوں گی۔“

”ہاں آں دلمنہیں تو بھیر الکڑی یا ہیں ناکہ پینچھہ میں گئے اور خرید لائے“ بڑی آپا کی آواز

میں اگر جی پیدا ہو جاتی تو تانی اماں، اچھی دلمن گری پڑی نہیں ملتی ہے۔“
 موضوع اس آہنگ سے بدلتا کہ اسے احسان کرنے ہوتا۔ اس کی شادی سے ہٹ کر
 لڑکوں لڑکیوں کی عمومی حالت پر باتیں ہونے لگتیں اور بات کہیں سے کہیں پہنچتی وہ بھر
 الف یلر پڑھنے میں لگ جاتا۔ اس نے اپنے بیٹھنے کے لئے ایسی جگہ منتخب کی تھی جہاں سب
 سے دیر میں دھوپ پہنچتی تھی۔ کیا ری سے ہٹ کر اجہاں پوچھنے کے ملا وہ بیلے کے بھی
 کئی پودے کھڑے تھے، نیم کا گھنا پیر تھا، جس کے نیچے دیوار کے سماں سے بھی کھڑو پنجی بنی
 تھی کہ خود ہری بھری اک کیا ری تھی، کورے کورے کھڑے کھڑے کچھی ٹھیکیاں، کالی اک صراحی جس
 کی پسلی بموت روی گردیں میں اکثر بیلے کے چھولوں کا گمراہ پڑا ہوتا، چمکتا و مکتمرا دآبادی گلاس
 اور نیم کے زردی مائل سفید چھول کو کھڑوں کی بھیکی طشتاریوں پر، گلاس میں، کھڑو پنجی پہ
 ایک طرف رکھی ہوئی پالوں کی تربتر تھامی میں، اور کھڑو پنجی کی کچھی زمین پر کھڑے ہوتے۔
 سرکنڈوں کی تیلیوں والا مونڈھا اس نے کیا ری اور کھڑو پنجی کے بیچ میں دیوار کے
 سماں سے ڈالا تھا اور اسے اپنی مستقل بیٹھک قرار دیا تھا۔ پاس ہی پھر کھٹ پہ بڑی آیا، ای
 اور تانی اماں بھی رہتیں، باتیں ہوتی رہتیں، پاندھان کھنکتا رہتا اور سرو طچتا رہتا کچھی کھی
 باوا کا بیٹھک میں بیٹھے ہوئے دم کھٹنے لگتا اور ایک چار پافی نیم کے نیچے پڑ جاتی۔ چاروں
 طرف پلے پلے اور زردی مائل سفید بو سیدہ کا نہذ پھیلے، بیچ میں باوجو عینک لگائے
 ہر کا نہذ کے ایک ایک لفظ کو احتیاط سے پڑھتے اور پرانے دراز نے ایساستے میں تکری کے
 رکھتے جاتے۔ اس عرق ریزی کے باوصفت ایسا رقد کوئی اب تک ہاتھ نہیں آیا تھا کہ
 گردی پڑی جو میں کامقد منجتھے کی صورت پیدا ہوتی۔ لمبا بھری سا قدر، زانگندنی، بال کھڑی
 خاندان میں پہنچتھے کہ پالوں پہنا اور سرکاری نوگری کی تانی اماں کو ان کی روشن پر
 ہمیشہ اعتراض رہا، کہا کرتی تھیں ”اجی تحصیل داری سے پہنچے بھی طور یہی تھا۔ برجس ڈالے
 فل بوٹ چڑھائے کھٹ کھٹ کر تاشکار سے واپس آیا۔ بندوق کو نے میں کھکھلے گئے

سے آتا، فل بوٹ ایک طرف چھٹک ہو چوکی پر کھڑا ہونماز پڑھنے لگا۔ میں ہا ہا کر تھی کہ
شبومیاں برجس آتار دو، و صنوکر لو، شبومیاں کہاں سسنسنے ہیں دستائی اماں ولایت میں بھی
لوگ نماز پڑھیں ہیں۔ وہاں پسجا مہ کوئی نہیں ہپنسا، «خاک جھو جمل موئے دلامبٹ والوں پر
برجسون اور پیلوں نوں میں لوگ نماز پڑھنے لگیں تو قیامت نہ آجائے اور بی بی تحصیلداری
کے بعد تو جنتیلینی میں جو کسرہ کئی بھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ اب امیاں بخچہ دو بی کو طعنے دیوے
مختہ دستائی اماں تمہارے بثیر جسیں تو بالکل انگریز ہو گئے ہیں۔ تم نے پالا تھام ہی جانلو؟
اے میاں میں کیا جانوں؟ میں نے پالا تھا یہ ختوڑا، سی کہا تھا کہ بیٹا انگریز بن جا، مگر عمر
کے ساتھ ساتھ اب انگریزیت بھی بہت کم ہو گئی بھتی۔ رہی تحصیلداری سوائے تو بخیر بھٹی لے کر
لیکن اب امیاں کے گزرنے کے بعد اتنی ذمہ داریاں آئیں می تھیں کہ یہی سوچا کہ پیش میں اب کون
سی مدت باقی ہے، یہ مدت خست پر کاٹو، آخر خست بھی تو برسوں سے نہیں لی بھتی اور
نوكری چاکری سے فارغ ہو کر کھر پر بیٹھو۔ حمویں کا مقدمہ ایک طرف، پھر زمینوں کی دیکھ بحال
کھٹی بارہی کا انتظام، پھر اس کو بھٹی کی منصوبہ بندی، جس کی تعمیر کا خیال پیش نے کر کھر
بیٹھنے کے خیال کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ روز من اندر ہیرے اٹھنا، بخونڑی پر جا کر کھیتوں کو
دیکھنا، کوئی کی جگہ کا جائزہ لینا، واپسی پر انہیں پیے لو سید و کاغذوں پر جھک جانا۔ کاغذ پر
پڑھتے تھک جاتے اور دم لینے کو عنیک آمار کے کاغذوں پر رکھتے اکم گوئی کے باوجود
کبھی کبھی کوئی فخر ہے۔ نکل رسی جاتا۔ بڑی آپا کی توجہ فوراً بالتوں سے ہٹتی، بھائی کے
نکر مندر پھرے کو تکنے لگتیں «ایہ تو بڑا غصب ہو گا۔»

باواناخوش سے بچے میں کہتے «ابامیاں بھی تو غصب کر گئے ہیں۔ اتنا سود نہیں
کے لئے رقم کہاں سے آئے۔»

بڑی آپا کی آنکھیں بھیکنے لگتیں، آواز میں رفت پیدا ہو جاتی «باغ تو پہلے ہی بیگ چڑھ
گیا تھا، بزرگوں کی بچی بچی یادگار بھی.....، بڑی آپا چب ہو جائیں، پھر کنے لگتیں امال جی

یہیں سے سوہاریں، ابامیاں نے اسی گھر میں آنکھ کھولی اسی گھر میں آنکھ بند کی۔ بڑے ابا نے بھی اختری صانس یہیں لیا۔ بڑی آپا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور باوا پھر کاغذوں کو پہلے بے دلی سے اور پھر نماک سے لٹکنے لگتے۔

اس کی آنکھیں میں پوری حوصلی کرتا تھا ایک برا عظم کے محی گھومنے لگتی، داث کی چھتوں والے اوپنے کشادہ کمرے، کشوں دروں والے لمبے لمبے دالان، مٹی میں الی اندری بخاری جس کے اندر جانا نکتے ہوئے اسے ہمیشہ ڈر لگا کہ کہیں بخاری کی بآسی بیجا اندر نہ کھینچ لے، نہ خاہ جس کے اور چھوڑ کا اسے کبھی اندازہ نہ ہو سکا کہ اس کے تین جنگلے دالان کے نیچے مگن میں نسلکے ہوئے تھے مگر ایک جنگلا دالان کے اندر کے بغلی کمرے میں بھی نسلکتا تھا اور ایک جنگلا بڑے کمرے کے اندر والے جھوٹے اندریہ کریے میں کھلتا تھا اور لمبی چوری ران جہاں چھتیں کر زینے میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا کہ کسی اجنبی لیک میں داخل ہوئے ہیں اور کسی کسی کچی چھت پر اگی ہونی گھاس کہ برسات نکل جلنے پر سوکھی مرند ہو جاتی اور کسی قدمی زمانے کی یادگار نظر آتی پریڑی جیسے سوکھ پت نالے کہ سوکھ جلانے والے وہا سے لگتے اور پھر وہ پرو اسرار سرحد، سفید بیٹوں سے لسی ہونی کا لی پڑتی منڈیری جس کے پرے اوپنی نیچی کچی پیچی ان گنت چھتیں چھلی نظر آتیں اور آگے ان سے وہ سرخ پھر وں والا اوپنی مندر برا عظموں سے پرے ایک اور برا عظم، جہاں اوپنی ہمایہ سرائھاٹے دکھائی دیتا، اللال مندر چھوڑ کر کہ حوصلی تو کیا ہمایہ سے بھی اوپنیا دکھائی پڑتا۔ حوصلی کی چھت بستی میں سب سے اوپنی بھتی حوصلی کی وسعت اور اوپنیا کا پورا احساس اس وقت ہوتا تھا جب تا فی اماں غدر کے دنوں کا ذکر سناتی تھیں جب بی میں تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہونی بھتی بڑی ماں سنایا کریں تھیں۔ ایسی لش پڑی اور آپا دھاپی پڑی کہ ایک کو ایک کی خبر نہیں پھری لیتیں ایسی اجردیں کہ نہ کوئی نام لیتے والا ریاضہ پافی دینے والا کو سوں چراغ جلے تھا نہ دھوال اٹھئے تھا جاٹ۔ گو جر انگر طھ پورے نے دھولئے بھائے بلم پچاتے دندناتے پھرتے آج بیگاوں

ووٹا، کل اس بستی پہ ہلا بولا پرسوں فلاں شہر پہ جا پڑے۔ کوئی شہر کوئی گاؤں نہ بچا کہ جہاں خدر نہ مچا ہو بلیں ہماری بتی پچھی تھی۔ سب نے مل کے کیا کیا کہ اپنی اپنی عورتوں کو حولیٰ میں بھیج دیا اور خود لمحہ تا ان تا ان کے بستی کے گرد پھرہ دینے لگے۔ حولیٰ کی چھپت یہ سمجھ لو کہ سب سے اوپنجی تھی دوستک کا ادمی وال سے نظر آوے تھا تین آدمی فقار سے لے کے چھت پہ بیٹھ گئے دن رات جائیں تھے۔ مٹھے گو جروں نے تین دفعے بلہ بولنے کی تھانی۔ یعنیوں مرتبہ لقاہ نجح نک لیا اور وہ تینوں دفعے پاہر سے ہی فورٹ لوٹ گئے۔

حولیٰ کی بلندی بھی قائم تھی اور دسعت بھی انگروہ پرانی کتنی ہو گئی تھی۔ میٹاں اور برجیاں کچھ تو ایسی ٹوٹی تھیں کہ اس آثار باقی تھے۔ جو باقی تھیں ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں ہندوویں کالی پڑھکی تھی اور دیواروں سے بو پیدہ پسٹر کے پرست کے پرت گرتے تھے اور اتنے گر کے تھے کہ گلڑ یا انہوں سے بنی دیواریں نکلی ہوتی جا رہی تھیں اور گلڑ یا انہوں کی درزوں سے پہلی سیلی مٹی ہر وقت گرتی رہتی تھی۔ دلان میں گردوں میں فرش پر دیواروں کے سماں سے جا بجا پیلی سیلی کی ننھی ننھی ڈھیریاں پہن جاتیں اور پھر ان میں سے کبھی اللہ میاں کی تھیں منودار ہوتی کبھی تسلیارا جدا سے خوب کر دیتا اور اپنے لئے سوراخ پیدا کر لتا۔ پرانی جو چیز نظر نہیں آتی تھی وہ اتنگن تھا لمبا چوڑا کچا آنگن کہ تیسرے پھر کو سقوچب پہلی مشک بہانا تو بس تھوڑی دیر کے لئے زمین گیلی نظر آتی اور بجا پ اٹھتی دھکائی دیتی اور اس کے بعد پھر زمین پس اسی کی پیاسی کمی مشکیں چھڑ کا دہونے کے بعد زمین بھیکتی اور خوشبو دستی اور پھر باوا کا تازہ حصہ منڈڑھے کے آگے رکھا بھار دیتا اور وہ نیک جسے وہ بچپن سے دیکھتا آرہا تھا۔ اور جانے کب سے کھرا تھا گرا سی طرح ہرا چھرا اور رکھنا تھا کہ اس کے لئے ہیش چھاؤں رہتی چھر وہ گھڑ فربخی کے مانند ہری بھری کیاری کے تھی اور وہ کیاری کشمکش گھڑ و پچھی کے پانی میں تریز رہتی اور خوشبو سے ممکنی رہتی۔ گوری لمبی انگلیوں میں جھکلتے صرا آبادی گلاس اور اس میں کچی چیلیا سے کبھی کوری صراحی سے گرتے تھے جھکتے یہٹھے پانی کا ربا شور استحیہ اس کی

درن تو جس کئے بغیر پانی بی گلاس ٹھڑے کے چھے رکھ بھر باور چی خانے کی لرف جلی جاتی اور
وہ پھر الف یلمہ پ، جو اس نے اب امیاں کی کتابوں سے نکال کر وقت گزاری کی نیت سے
پڑھنی شروع کر کی تھی، جبکہ پڑھنے پڑھنے کھو جاتا اور بھٹکتے ہوئے شہزادوں
کے ساتھ خوب صورت ٹک دل سا ہر اُول کی محل سراؤں میں داخل ہو جاتا... ”ہوابندہ گوشی“
برڑی آپا کی آواز کے ساتھ وہ ایک ساتھ الف یلمہ کی محل سر سے باہر آ جاتا اور اس وقت
اسے پتہ چلتا کہ بدن اس کا پسینے میں بھیگتا جا رہا ہے۔ بہزو مرخ لمرلوی والا پنکھا برڑی آپا کے
ہاتھ میں گردش کرنے لگتا۔ ”بکھتِ ابھی سے اتنی ملکھی ہے برسات میں تو جنیں کیا ہمال ہو گا؟“
تمامی اماں تو کہتیں ”بی بی برسات کہیں ہو تو سہی۔ اس اڑگزر جلا اور پانی کی بو ند نہیں پڑی۔

تو بابکے تو بہت گرمی ہے میرا تو مردیوں سے پندہ ابر گیا۔“

پھر تم کی ٹھیکیوں میں ایک ہلکی سی مردش تیرتی پلی جاتی اور انی کہتیں ”اللہ تیر انگر“
نیم کی لگتی ٹھیکیوں کے کسی گوشے سے اچانک فاختہ بونا ضرور کر دیتی اور ساتھ
اس کے بھی آواز میں آواز ملانے لگتی ”کوئوں گی..... پیسوں گی..... آیا تھا..... گیا تھا
..... کوئوں گی، پیسوں گی ما آیا تھا ما گیا تھا.....، فاختہ بولنے لولتے چپ ہو جاتی اور
پردوں کی رسیبلی سرمنی پھر طراہ ہٹ کے ساتھ ٹھیکی سے بلند ہوتی، ایک چڑھ کھاتی اور
پھر کوٹھے سے پرے نکل جاتی۔

تحیث باور چی خانے سے نکل کیا ری پر آبھتی اور پو دینے کی غنی ملکتی ٹیکیوں کو چلتے
پہنچتے ہوئے کے بالکل قریب آ جاتی کہ وہ گوری گردن پر پسینے کے شفاف قطرے دیکھ سکتا
ہے۔ ٹیکیوں کے چھے سرخلے ہوئے ہیں بال جھیلک گھوری گردن پر چکنے لگتے اور سعید والی کی
اک نیکیں کہیں سے بھیگ کر شدید بھری ہوئی لپشت میں پیوست ہوئی نظر آتی۔
گردن اور لپشت سے نظر پہنچ کر وہ پھر الف یلمہ پر نظر ملکاڑ دیتا لیکن چند ہی ملحوظ میں عزم
کا ٹوٹنے لگتا اور نظر میں اس کی بھر جو ری چھے چکتی اور بندھی ہٹیا پر گوری گردن پر بھری بھری

پشت پر، پورے نئے کی نہ کنیتی ہر گلی بیویوں میں رینگتی ہوئی اور حکیمتی ہوئی گوری تپلی انگلیوں پر بھکنے لگتیں۔

ای کی ہمدردی کی رُگ اک روز بھڑکی تو بول بڑیں "بڑی آپا تھیں غریب تو کام کرتے کرتے ہلکا ہوئی جاوے ہے۔ اتنے بڑے بڑھ کا سارا کام ایکسا بانپ پڑ گیا ہے یہ بھی کوئی بات ہوئی"

بڑی آپا بولیں "ہلکا ہونے کی کیا بات ہے اس میں۔ مگر کام ہے باہر والے مخنوڑا ہی اسکے کریں گے۔"

"بڑی آپا،" امی بولیں "تم نے تو یہ تم کیا ہے کہ سارا کام اس پر موال دیا ہے؟"

"اجی کنواری نومنڈیوں کو کام کی عادت ہوئی چاہئے۔ آخر پر اسے مگر جانا ہے، وہ انہیں چھپر کھٹ پر جھاکے کون کھلاوے گا۔"

"اے لو بڑی آپا تم اٹھی بات کہو ہو۔ کنوار پنے کے دن ہتھی تو ہو وے ہیں کہ ہنس بول لو، اس کے بعد کہاں یہ ہملت۔ نابی بی یہ بھی کوئی بات ہوئی، میں بھی بھی بھی کہتا کہ بان توڑوں ... ،

"نا ہو میں مہمیں چو لئے پہ نہ بیٹھنے دوں گی۔" بڑی آپانے فوراً احتجاج کیا۔

ای نے عزم باندھا اور توڑ دیا۔ کام پھر تھیں ہی کو کرنا پڑتا مگر کا نظام اسی پر لے ڈھرے پہ جاری رہا تھیں کی لفایت شعاراتی کے احساس نے یہ فرق ڈالا کہ اسی کا پیسے کوڑی بھی اس کے پاس جمع رہنے لگا اسے روز اس کے ساتھ ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ کتنے؟ وہ سوال کرتی۔ جتنے مانگتا اتنے دے دیتی، مگر اس تکلف کے ساتھ گویا پیسے ضائع کرنے کے لئے دیئے جا رہے ہیں۔ اچھے اور بدیں آن نازل ہوتے اور اس سے ایک ایک آنے و سوں کر لیتے اور پھر گھر بھر میں اس کا اعلان کرتے۔ بنی کو بڑی آپا جھٹکتیں پھر اس پر گکڑ تیں۔ بیٹا اسے کیوں پیسے دیے جلتے ہیں۔ چٹوری ابھی بازار جاوے گی اور پھر

ئے گی۔» اچھے کو پیسے ملئے پرتاٹی اماں اسے بھر بھر گود دعا ہیں دیتیں «باپ کے طریق
افسر بننے، حکومت کر کے، سہرا جلدی بند ہے، چاند سی دلمن گھر میں آوے، ماں باپ بھاریں
لیجیں، تانی اماں کے بال سفید ہو گئے تھے، لیکن کامیٹی ابھی تک بُنی ہوئی تھی کہ پانچ ماہ
چنس کے ٹانگوں میں آتا تھا اور چھر سے کی جھربلوں کے باوجود پتہ چلتا تھا کہ کسی زمانے میں
سین ہوں گی۔ ایک بڑی آپا تھیں کہ جسم کی عمارت مل گئی تھی اور دو ہزار پندرہ وہر اہوتے
ہوتے بھی الکرا ہو گیا تھا کہ جو کپڑا پہنچیں خلتے سے لکھتے تھا تانی اماں کس شستے نے لائی لام
تھیں اسے اب تک پتہ نہیں تھا؛ ایک دو کی نہیں گھر بھر میں سب ہی کی تانی اماں تھیں،
ہماں تک کہ اب امیاں بھی انہیں تانی اماں ہی کہا کرتے تھے ماں کی بیٹی کے متعلق اسے میں
حضرت لاڈھنڈ لاخیاں تھا کہ ایک گوری چٹی بڑی بڑی سانگھوں والی بیٹے قدر کی عورت تھی۔
اس کی حضت کے بعد بڑی آپانے کہا تھا تانی اماں کی نونہ یا تو ڈوب گئی یہ تو بالکل
وار لوگ ہیں، اور امی نے جواب دیا تھا ماجھی اب عرض کا تارا تھوڑا ہی اترتا۔
اچھا ہے غریب لوگ ہیں نونہ یا کو اچھی طرح رکھیں گے، اچھر کپ اور کیسے؟ یہ اُسے باد
ہیں تھا، میں آتنا باد تھا کہ مرنے کی اس کی خبر آئی تھی جب تانی اماں اس کے چالیسوں
کے بعد واپس آئیں تو ایک گورا چٹا بچہ ہر وقت ان کی گود میں ہٹزا اور اچھے کے نام سے
سے کلا تھیں اور پیدا نہیں۔

اچھے اور بُنی پیسے ملئے ہی تیر کی سورت باہر جاتے اور تھوڑی زیر میں وہ دیکھتا
کہ سینکوں میں لگے ہوئے برف کے گولے جن میں زرد، سرخ، بزرگ تیرتے ہیں ائے جلے
ہے ہیں اور زیان لگا لگا کے انہیں چاٹتے ہیں۔

منوہرے پر بیٹھے بیٹھے وہ تھک جاتا۔ انت لیلہ بند کر جھانیاں لیتا، پھر اس کی نجیں
بند ہونے لگتیں، اتنے میں بڑے کمرے سے بڑی آپا کی آواز آتی "ارے بھی مظہر کہاں
میں ابھی تک باہر بیٹھے ہیں۔ تھیں بھی کو بلدا کر کھانا کھالو، تھیں باہر آتی، اروکھے چکیے انداز

میں کہتی «کھانا کھا لو چل کے»، اور وہ اُنھیں کھڑا ہوتا۔ بھی کبھی وہ اتنا بیزار ہو جاتا کہ کافی کو اس کا مطلع ہجی نہ چاہتا۔ اسے اپنے آپ پر عصداً تھا۔ تھیں پہ خصداً تھے، بند ہو جانے والی ہوا پہ، جنہیں خاصی ہوئی تھیں پہ، چھٹیوں کے طویل ہوتے دنوں پہ تھیں پھر اگر اسی روکھے چکیے انداز میں کہتی «کھانا کھا لو چل کے»، اور وہ الف بیلہ بند کر پھر چکے سے اس کے تیکھے ہولتیا۔

(۳)

«بھلی بھلی میر بیاہ کدھر؟» اسیا کی گھٹھلی کی گری سنبھلی کی فرم انگلیوں سے محفل کر چارپائی سے نیچے چاہ پڑی۔

چارپائی پہ ایک درپ ہرے چھلکوں اور کٹی ہوئی سفید بھلیوں کی ایک ڈھیری لگی تھی۔ اور پاس ہی سعید تسلی میں سفید چھلی ہوئی اسیاں بھری رکھی تھیں۔ تھیں سفید چھلی ہوئی تابت اسیا اٹھائی، چاؤ سے دو کرتی اور پھر چاقو کی نوک سے بھلی کے ڈکڑاوں کو نکال اسیا کی قاشوں کو تسلی میں ڈال دیتی۔

بنی نے اپنی حکمتی ہوئی تابت بھلی اٹھائی اور ضمیر کے موزڈھے کے پاس آکھڑی ہوئی «ضمیر بھائی تباہ میر بیاہ کدھر ہو گا؟»

«خود بوجھ لو، وہ اس وقت الف بیلہ پڑھنے میں ایسا مصروف تھا کہ نظریں اٹھانا بھی ناگوار ہو رہا تھا۔

بنی نے بھلی سے اپنا بیاہ پوچھا، پھر اچھے کا بیاہ پوچھا، پھر ضمیر بھائی کا۔ ضمیر بھائی تھا را بیاہ پہنچ میں ہو گا۔

«اچھا، اس نے بے انتہائی سے جواب دیا اور پھر کتاب پڑھنے لگا۔
«بھلی بھلی باجی کا بیاہ کدھر؟»

بجلی ٹپ سے اس کی کھلی کتاب میں آکے گری۔

ہن نے تالی بجا کے شد عپایا سدا ہا با باجی کا بیاہ غیرِ بجا تی سے ہو گا۔“

دل اس کا دھک سے رہ گیا: خون خشک، اور ہاتھ پر جانو بجے کے بھے رہ گئے بس یہ خواہش کر کسی طرح انکھوں سے اوچل ہو جائے، باہر جلا جائے پر جسم ساکت تھا اور نظریں کتاب پہ اسی طرح جھی ہو گیں اور دل و حضر و حضر کرتا تھا۔ ہوا پھر بند ہو گئی تھی اور ٹھنڈاں نیم کی پھر سر پنوڑ ہائے خاموش تھیں، پینے کے قدرے اس کی گردان پہ اور اس کے ماتھے پہ ابھرائے تھے۔ گردن پر سر راتے قدرے کار کے اندر سننے لگے۔ پھر ایک پتلی گلی لیکر تیعنی کے اندر پڑھنے پر سرکتی ہوئی رنگے لگی۔ دل میں آئی کہ کتاب بند کرو اور انکھ بچا کر آہستہ سے باہر نکل جاؤ۔ مگر جسم تھا کہ اسی طرح اپنی جگدیہ جما تھا تھینہ کی طرف دیکھنے کی تو سے ہمت نہیں ہوئی تھی بلکن چاقو کے ایسوں میں در در لئے اور بھلیسوں کے سیلوں میں اترنے کی مددم آواز ای غفار سے بغیر کسی فرق کے آئے جا رہی تھی۔ ہوا بند تھی اور ٹھنڈاں نیم کی سر پنوڑ ہائے خاموش پھر فاختہ نے نیم کی کسی خاموش شئی پہ بیٹھنے پڑھنے لونا شروع کر دیا۔ بجلی سے بھنی کی توجہ بھلکی درودہ آواز میں آواز ملانے لگی۔ کوئوں کی..... پیسوں کی..... آیا تھا... گیا تھا... کولوں گی....“

”صیح کا سلو باد کر لیا ہے؟“ تھینہ بولی اور بھنی کو جانور بریک لگ گیا۔

”س... ب... ق...“

”ہاں سبق“ تھینہ نے اسی الطینان سے درشت لیجے میں کھا اور چاقو الگ رکھ تسلی سخال چار بپا تی سے اٹھنے لگی۔
بھنی خاموش۔

”نکالو سیارہ اور پڑھنے پڑھو۔“ اس نے کڑی نظر وہ سے اسے دیکھا۔

ہن کا دم خشک، یتربی طاری ساری ختم، سمجھو کوئی قیدی ہو، اس نے بڑی بے چارگی

سے آہستہ آہستہ حریان کھولا۔ وہ انگلیاں وہ ہاتھ جن میں ابھی بھلی سے بیاہ پوچھتے ہوئے
بھلی دوڑتی تھی، اب غبور تھے اور حکم کے پائیں۔ اس نے سر ہوئے دل سے بیپارہ نکالا
اور ورق المٹ پلٹ کر کے سبق ڈھونڈنے لگی۔

تجینہ نے ایسوں کا تشداد تھایا، یہم کے یچے سے اٹھ کر دھوپ میں پڑی ہوئی چارپائی
کے پاس گئی، تسلیم اور ایسوں کی قاشوں کو کھری جا رپائی پہ پھیلانے لگی۔
ضمیر کتاب آہستہ سے بند کر، موڑھے پہ رکھ، دبے پاؤں باہر ہولیا۔

گلی خاموش تھی، خاموشی میں کھلی ملی ایک بھینہناہٹ، ایک گوچ کر کہیں دوڑشمہ
کا چتا لوٹنے پر بہت سی کھیاں بھینہناہی ہوں۔ گلی میں چھاؤں پھیلی تھی، سوا ان دیواروں
اور نالیوں کے جن کے مقابل کے مکان اوپکے نہیں تھے۔ ایک کتا کہ جانے کب سے نالی
کے گندے میلے پانی میں بیٹھا زبان نکلے ہاپ رہ نخا۔ قدموں کی آہٹ سے باہر نکلا،
پورے جسم کو ایک بھٹکا دیا اور گیلے جسم سے بوندیں بر سانا ایک طرف کو ہولیا۔ اپنی گلی سے
مردستے ہوئے کوڑے کے ایک ڈھیر پہ اونگتی ہوئی سر عنزوں نے چونکہ جو بچیں انھائیں
اور ”کرڑ“ کی ایک دیجی سی بیس ساخڑ آواز ہوئی۔ سوم بھر کے لئے اسے گمان لگرا کہ بھول کر
کی اجنبی گھر میں کسی زمان خانے میں داخل ہو گیا ہے اور ایک دم سے بہت سی نظریں اس پر
انٹھ گئی ہیں وہ آہستہ سے آکے بڑھ کیا جند قدم چلا تھا کہ یچے کسی مرد سے بازو بھٹ
بھٹنا سئے اور گکڑوں کی آوانہ بلند کی۔ سامنے دیوار کی سایہ دار مندر پر پہ ایک انگھتا ہوا سید
براق مرغ اچونکا بھر پری لی، زور سے بازو بھٹ بھٹکئے اور گکڑوں کوں کی بانگ بلند کی۔

گلی سے نکل کر وہ لال مندر کے چوک میں آگیا۔ لال بچر جل رہے تھے۔ بچعل رہتے تھے۔
کنوں میں ای شرخ شکیں من تپ رہی تھی۔ لوہے کی چھوٹی بڑی چڑھیاں لکنوں کے دھانے
کے گرد نصب تھیں، اخشک تھیں، خاموش تھیں۔

پہاڑی گلی سے نکلتے ہوئے اسے خندک لگی پر گھڑی بھر میں ٹھیکھر دل والی گلی آگئی۔

چہاں دھوپ اور دھواں نکھا اور بے شکل دھاتوں اور پتیل اور تابنے کی بڑی بڑی تھالوں درد گچھوں اور تیرڑوں پر پڑتی ہوئی چڑوں سے یہ سور کہ کان پڑتی آوازنا فی ندیتی تھی۔ سور کہ ہوتا گیا یہ سچے گم ہوتے رستے میں پشتا گیا۔ کنجڑوں والی گلی میں کالا بسجرا کیک پچ میں انداھڑا نکھا کو شتش پر بھی جب وہ لش سے مس نہ ہوا تو وہ دیوار سے لگ کو اہستہ اہستہ چلتا، لاتوں اور سینگوں کی مار بے سختا، گلی سے باہر نکل گیا۔ گلی سے قصایدوں کے عملے میں، قصایدوں کے خندے سے پکی سڑک کو چلا لگتا ہوا دکڑے میں، دکڑے سے بھوزڑ دلے رستے پہ۔ لے دیکھ کے گندل کھڑا ہو گیا، ایسے ہیسا، اس نے ہیرا کو پکار کر کہ بلا بیا «چھوٹے میاں جی آیو ہیں، ہاتھ ڈال دے۔»

ہیرا چارپائی لئے دوڑا دوڑا آیا، چارپائی نیچھاتے ہوئے بولا «میاں جی جل پانی لاوں۔»
«نہیں بھی۔»

گندل چلم کے چارپائی کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ کنوں اس وقت تھیں چل ہاتھا۔ اور گندل اور ہیرا فارغ نظر آتے تھے۔ گندل نے چلم منہ سے رکائی اور آنکھیں اسکی منہ نے نہیں ہیرا اس کے آنے پر کچھ زیادہ پر جوش نظر آتا تھا۔ انکھوں میں اس کی چمک پیدا ہو گئی تھی اور ایک بے تابی کر کچھ کہنا چاہتا ہوا اور کہہ نہ سکے۔

«چھوٹے میاں، آخر اس کی زبان کھل ہی گئی «چھوٹے میاں،» یو کیوے ہیں کہ یاں پر کوٹھی بنو گی۔ وا کے بعد تو سگرا بیٹھویں سے یہیں پر آ جا یوے گا۔ جدوں ابا میاں تھے تو یاں پر گھنی دنکر یوے تھی۔ کٹائی کے دلوں میں تو سگرے یہیں پر رہوے تھے۔ پر وا کے بعد تو... ہیرا کی آواز دھیمی پڑ گئی «و نام رام کا،»

وہ چیپ بیٹھا رہا۔ گندل بھی چیپ تھا، آنکھیں بند تھیں اور چلم کے کش باری تھے۔

ہیرا پھر بولا «تو چھوٹے میاں، تھیمل دار صاب اب تو مکیں گے؟»

ہمیسے «اس کی طرف سے گندل نے جواب دیا اپنشن لے رہا ہیں۔ وا کے بعد یہیں

لکھیں گے۔“

”تو جھوٹے میاں، تم بھی پلت کئے نہیں جائیو۔“

”لشکر کی تو پڑھائی پوری نہیں بھی ابھی۔“ گندل نے پھر اس کی طرف سے جواب میں دیا۔
پھر اس نے انکھیں کھولیں، کھالناسا اور چلم کو ہیر کے ہاتھ پکڑا تاہم ہوا بولا۔ جھوٹے میاں اب تو
لکھنے برس بیت گیو، یا لوٹری پڑھائی کا کب انت بھی گلا۔“

بس تھوڑے سے ہی دن باقی رہ گئے ہیں، اس نے جواب دیا۔

مگر گندل اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ اس کی انکھیں اس پاس کی چیزوں سے ہٹ کر سامنے کے کھیتوں میں پہنچ گئی تھیں بھماں ہر یا لی یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ہوتا تھا، جلدی جلدی چلتی ہوئی دھوپ اس کے تیچھے دوڑتا ہوا سلیا۔ اب کی ہلکی چادر کھیتوں میں چیلیتی چل گئی اور دھوپ کھیتوں سے پرے پیڑوں کی قطار کو جھوٹی ہوئی آگے پھلانگ گئی گندل اور ہیرا دو لوگوں کی انکھیں اور اپنے لگائیں اور خود اس کی بھی۔ اکاڈ کا تیرتے ہوئے صفائی بادل آپس میں گھل میں کر سورج پہ چاگئے تھے۔

”گندل، ہیرا آہستہ سے بولا۔“ بلو درشا کیا کہو سے ہے۔ میری تو، گندل، کنوں چلاتے چلاتے کا پنج نکل گئی اور بوندہ پڑھی تو بیڑوں نی بدر جیا بیٹھ جاوے گی۔“ اس نے چلم کو آہستہ سے گندل کی طرف بڑھا دیا۔

گندل نے ناموشی سے چلم کا گھونٹ بھرا، پھر سورج بھر سے لمبجے میں بولا۔ درشا اب کے دیر سے ہو گی۔ جو تشویحی کبیوں تھے کیوں سال سخت ہے۔“ اس نے پھر چلم کا گھونٹ لیا اور ہیرا کی طرف چلم بڑھا دی۔ ”اللہ یو میں اپنے مندی ہو گئی۔ اپنارکھ دے۔“

ہیرا چلم کے کر بھو محل میں دبے اُپنے کے پاس جا بیٹھا۔ گندل کی انکھیں پھر مند نے لگیں۔ انکھیں مند نے لگیں اور ہونٹ ہوئے ہوئے ہلنے لگے۔

رات گنوائی سوئے کے دوس گنوایو کھاتے
ہمیرا جنم امول تھوڑی کوڑی بدلو جائے
گندل کی آنکھیں بند تھیں، جسم ساکت، سارے بدن کا جی آواز میں کھینچ آیا تھا کہ دھیرے
دھیرے ابھر رہی تھی، پھیل رہی تھی۔

چار پانی سے اٹھ دہ آہستے والیں کھر کی طرف ہولیا، کھیتوں سے پس کے درختوں
پر دھوپ پھرا ترائی تھی۔ دھوپ پٹ رہی تھی، درختوں سے کھیتوں میں اتر رہی تھی اور
چھاؤک کی چھاؤنی اٹھ رہی تھی۔

کھر میں اس نے قدم رکھا تو دن ڈھلنے لگا تھا اور دالان کے سامنے محن میں دو تک
چھاؤک کی جوڑی پٹی پھیل گئی تھی، لیکن بڑے کمرے کے دروازے ابھی نہیں کھلتے تھے اور
خش کی ٹھیپانی سے اسی طرح خرا بود تھی۔ محن سے وہ دالان میں آیا اور بڑے کمرے کی طرف
بڑھنے لگا کہ جاتے جاتے وہ جھجکا اور اس کا رُخ بڑے کمرے سے سہ پٹ کر بغلی کمرے کی
طرف ہو گیا۔ اندر قدم رکھا تھا کہ ابی اور تانی اماں باہمیں کرتے کرتے چونکیں۔
”اے ہیئے اس دوپہری میں تو کہاں تھا؟“ ابی نے فوڑا سوال کیا۔

”بھوڑ پڑے چلا گیا تھا درا،“

”بھوڑ پڑے ہوئے ہوش کی دوائے قیامت کی لوں چل رہی ہے اور شہزادے بھلکھل
پھر رہے ہیں،“

”اے ذرا ڈوبائش تو دکھو لال ہو رہا ہے،“ تانی اماں نے مکڑا لگایا اور آپسیٹ جا،
”میں بیکھا کر دیں،“

اس نے اس پیش کش کو غیرمت جانا اور جوتے اور قمیض آتا ر آہستہ سے لیٹ گیا۔
تانی اماں نے زور سے اسے پٹکھا کر ناشرد ع کر دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔
دوپہر کو سب بڑے کمرے ہی میں آرام کرتے تھے کر دہاں بڑا جمالہ والا پٹکھا رکھا ہوا

تھا جسے نوری دو پھر بھر لئے پھر تھی اور خس کی میاں و ردازوں پر کھڑی تھیں، جن پر نیسرے پر نکل بربر پانی چھڑ کا جانا تھا۔ لیکن اب اکثر بیجوں کے تصور کے بھانے ڈے کرے سے نکل کر بغلی کرے میں آ جاتیں اور کبھی کبھی تائی اماں بھی دیہیں آ بیٹھیں اور سونے کی بجائے دوپھری بھرا تیں ہوتیں، کبھی سرگوشیوں میں کبھی بلند آواز سے۔

”اجی ایک بات ہے،“ تائی اماں کہہ رہی تھیں ”لوٹدیا ڈوبی اکھی بھی بہت فراب سے سارے دن ادائی توں اپنے چھرے ہے پڑھنا یوں ہو وسے ہے، پناہ کے بیچے لوڑھے اخڑا دئی ہے خصہ آہی جاوے ہے ایسے بچے پر۔“
”وتائی اماں یہ تم نے کیا بات کہی۔“ اسی جواباً بولیں ”شریر آخڑکوں سا بچہ نہیں ہوتا،“ تھا اس اچاکم شریر ہے کیا؟“

”اے وہ سب سے زیادہ شریر ہے۔ آنا چناؤے ہے بھے کہ ڈو بامبر الورہ مل جاوے ہے۔“

”تو بس تائی اماں بچے تو شریر ہی ہوا کروں ہیں پرانہیں جان سے نہیں مارا جاتا۔ اجی اس لئے تو ہیں کو دھنک ڈالا۔ دے پنکھے پنکھا۔ میرا تو کیجھی ہل گیا۔“

”ہاں ڈو با ایسا یہاں جھی کیا کہ جان کو جان نہ سمجھے،“ تائی اماں چپ ہو گئیں۔

”ای کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ ہرے سے بولیں“ تائی اماں اس لوٹدیا میں کچھ نک ہے۔ کام کرے گی تو کام، ہی کرے جائے گی۔ ہن کو پڑھانے بیچے گی تو پڑھاتے ہی چل جائے گی۔ جیسے ساتوں علمر آئیں ہی پڑھ کے اُٹھے گی۔“

”جنہیں تو نسلی اثر ہے۔“ تائی اماں بولیں ”ماں کچھ کر ہے میں جو شک سوار ہو گئی سو سوار ہو گئی اور تیرا میاں ۔۔۔ اسے تو ماشاد العذر بال بچے میں، اوسدار بیاں میں جب بچہ تھا سب نکھلیں۔ ایسا صدری تھا کہ اب ایسا غصہ کرتے مارتے پر کیا مجاہل کہ وہ اپنی ہٹ سے مل جائے۔“

”ہاں خیریہ نسلی اشتہر ہے مگر تماقی اماں یہ بات تو اور ہے، اُنی کی آواز اور وہی پڑی اور سرگوششی میں کہنے لگیں۔ اجی یہ چھوٹوں آپا سے کب تک بٹھائے رکھیں گی۔ مانشا اللہ پوری نظر ہے۔ بیاہ شادی کی فکر کرنی پڑا ہے اب تو اس کی۔“

”ہاں بی بی عمر تو پوری ہے متمار سے صنیر کی اور اس کی اس بخوبی جھوٹی جھوٹی بڑھاتی ہے۔“

”اجی تماقی اماں صنیر سے تو بہت بڑی ہے تجینہ۔“

”تابی بی۔“ تماقی اماں نے قطعی انداز میں تردید کر دی۔ ”جب وہ پیدا ہوئی ہے تو صنیر پڑھ س تھا۔ مجھے تو آج کی سی بات یاد ہے کہ جب چھوٹوں چھلا نہماں تھی تو بیسوں نے کہا تھا کہ بولی بی نند لکو بیٹ گئی اب بجا وچ کو ساتھ خیریت کے خدا فارغ کرے۔ اس وقت تجھے ساتھ اس بھینہ تھا۔“

”خبر لوڈیا کے ساتھ تو ڈھانی میں مجینے کی جھونٹانی بڑاں بھی بہت ہو وے ہے۔

”لندن میں جلد بڑھیں ہیں۔ اب دیکھتی نہیں ہو صنیر سے دگنی عمر کی لگے ہے۔“

”ہاں مانشا اللہ اٹھان ابھی ہے۔“

”آخر کیا سوچ رہی ہیں بڑای آپا؟“

”کیا خبر ہے کیا سوچ رہی ہے یہ بھی نہیں ہے کہ پیغام نہ ہوں۔ چھاکا لونڈا نیجو دھے۔

”یمانداری کی بات ہے کہ باپ کے مرنش کے بعد جپا تایا کہاں پوچھیں ہیں۔ مگر وہ دوبار تو بھتیجی کے لئے تر سے ہے۔“

”لونڈا اگرے کیا ہے؟“ اُنی نے سوال کیا۔

”کیا پتہ ہے کیا کرے سے ہے۔ پڑھنا لکھنا جو گا تو وہ مہے نہیں۔ مدار کے ہیں میں بنیاد علیٰ نئے بنتے تو میں نے پوچھا کہ، اجی بنیاد علیٰ تھا اور امداد اندر نہیں کب کرے گا؛ کہنے لگے تماقی اماں، اندر نہیں تو کیا بی اسے بھی آج مل جو تھیں چٹھاتے چھریں ہیں۔ ڈوگری کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میں نے سوچا ہے کہ تمہارے امداد کو پولیس میں بھرتی کر ادوس سال میں تھانہ بندرا۔“

کانبر آ جاوے گا۔۔۔ ہاں بی بی تھانے دار ہو جاوے تو پھر کیا چاہئے۔ حاکی ہے وہ
تو مشی خالی ڈگری کوئے کے کیا کوئی چاٹے؟“
”اجی تائی اماں کیا باتیں کرو ہو، تھانے دار میں بتی تھوڑا ہی پھر رہی ہیں۔ الیف اے
بی اے کو تھانے داری لمتی نہیں ہے۔ اُجھد کو کون تھانے داری دے گا۔“
”بی بی مجھے کیا پتہ ہے تمہاری ڈوبی تھانے داریوں تھیں داریوں کا۔ بنیاد علی یہی
کہو سے تھے۔“

”بنیاد علی چا چا کے کہنے کا کیا ہے وہ تو ایسے ہی فیضیاں پھارا کرے ہیں۔ مگر خیر ہمیں
کیا، ادا و تھانے دار ہو جاوے تو ہمیں کیا برا لگے ہے۔ ہمارے تو پھر کی بیٹی جاری ہے
میں تو جانوں کے بڑی آپا کو اب سوچنا نہیں چاہئی۔ نوڑا ایسا برا تو ہے نہیں۔ اب تھیں کے
لئے عرش کا تارا تو اترے گا نہیں۔“

”کیا بخوبی اس کے دل کی کیا سوچ رہی ہے، تائی اماں بولیں اور آک ذرا معنی خیز
انداز میں۔“ اب میاں زندہ تھے تو ان کے سامنے بھی کمی دفعہ ذکر آیا تو وہ چپ ہو ہو گئے۔ وہ
جنہیں کیا سوچتے تھے۔۔۔
کمرے کا دروازہ ہوا کے ایک نند جھونکے کے ساتھ دھاڑ سے کھلا اور پیار خ سے
بند ہو گیا۔

”آندر جھی آری ہے۔ تائی اماں بے ساختہ بولیں
اس کے بھی چونک کراں کھول دیں۔ دالاں میں اندامگن میں زردی کھنڈ میں تھی۔
”پھرے اٹھا داپنے اپنے ہازر کی آمد ہیلادی ہے۔ بڑی آپا صحن سے چلا رہی تھیں۔
تائی اماں، امی سب کے سب باہر نکل گئے اور انکنی بہ پھرے اور چار پانیوں پہ
بکھرے بستر پیک جیک اٹھنے لگے۔

”اچھے، او اچھے آندہ آ جا۔ تائی اماں اچھے کا ہاتھ پکڑے ہوئے آندہ دالاں میں سکیں۔

بچر پکارنے لگیں جبی بی اندر آجائو، کامی آندھی ہے یہ تو،

آندھیوں کا ایک تانبا بندھ گیا تھا۔ ہوا چلتے چلتے بند ہو جاتی، بڑی آپا کے ہاتھ میں سبز اور سرخ لہریوں والا پنکھا تیزی سے گردش کرنے لگتا۔ فاختہ بولتے بولتے نیم کی چینگ سے بازوؤں کی ایک بیٹھی بچر پھر اہست کے ساتھ اٹھتی چرخ کھاتی اور فضائیں تیرتی تیرتی آنکھوں کے اوچھل ہو جاتی۔ لکوا دکوا د، کی نشیل شیریں آواز کر جانے کوں سے آم کے پیڑ کی کون سی گھنی ٹھنی سے پردا کا جھونکا بن کر اٹھتی اور گرم پیتی فضائیں ٹھنڈک کی اک لکیر چھپتی چل جاتی۔ ٹھنڈک کی لکیر چھپتی چلی جاتی، گھری ہوتی چلی جاتی، بچرا ک دم سے کوئی کی آواز بندہ ٹھنڈک کی لکیر فاٹ۔ تانی اماں پنکھا برڑی آپا کے ہاتھ سے لے لیتیں "لبی برڑی گرمی ہے۔" ہوا بند جو گئی ہے اور برڑی آپا یکا یک اس سے مخاطب ہوتیں "ضمیر تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ اندر پنکھے میں جا کے لیٹ جاؤ ہر وقت پر ڈھندا ڈوبا پر ڈھنا نہ ہوا و بال جان ہو گیا۔" اور اتنے میں تانی اماں کا پنکھا جھلتا ہوا ہاتھ ڈھیلا پڑ جاتا اور آنکھیں آسمان کو تکنے لگتیں، کھوئی کھوئی آواز میں، جس میں امید کے ساتھ ساتھ آندھیتے کی بھی ایک خفیت سی کیعنیت ہوتی اسپیں "آنڈھی آرئی ہے،" ساری کی ساری نظریں ایک دم سے اور اٹھ جاتیں، جہاں آسمان پسند نہ کرنا اور اس کے ساتھ میں بہت سی چیلیں آہستہ آہستہ دائرے بناتی ہوئیں، نشے بن نہ حال ناچھیں غش کھاتیں بچرا چانک سے نیم کی ٹہنیوں میں ایک بیجا فی دریشہ ہوتی اور کسی گھنی ٹھنی میں کوئی چیسا کو اچونک کر تاں، کرتا اور پتوز کے ہر سے پورا دل سے سکل کر باہر آتا اور چھنیا پیختا کوؤں کے شور پختے بھاگتے دوڑتے سرکیسہ غول میں جا شا طا ہوتا۔ چڑیوں بور کوؤں کی سرکیسہ مگی نیچے اترتی اور مرغیوں کو چوکا تی کہ ان کی کروں میں ایک دم سے تقا، کی دھیمی سی آواز کے ساتھ کھڑی ہو جاتیں اور کان کچھ سننے کی کوشش کرتے۔ بچر پھر پھر اہست النول، پرانا اثر دکھاتی۔ دوسری بیسری منزل پر کسی کھلے درتیکے کے کنوواڑ ایک اپانک شور کے ساتھ بند ہو کر کھلتے اور بچر بند ہو جاتے "میا آندھی آرئی اے،" اور

یہ آفاز کو بھوٹوں کو بھوٹوں بلند ہوتی چلی جاتی۔ قریب و دور پھیلی، موئی کچی بچھتوں سے چار پاسوں کے بستر اور تاروں پر پڑی ہوئی سپینہ سفید چادریں اور نیلی نیلی ساڑھیاں اور دھوپ میں سوکھتے اور گیلے نیلے گلابی فیروزی دوپٹے گرد میں اٹھنے لگتے اونے لگتے، بڑی بوڑھیاں بڑاکیاں بڑاکیاں پیک بچپک دوپٹے اور ساڑھیاں تاروں سے اتا رہتے تاروں پر رکھ منڈ میریں پچھلاں مگریں سیڑھیاں اترنی نیچے آنے لگتیں اور کمروں کے دلفانے سے اندر سے بنہ ہونے لگتے کہ اتنے میں دیکھتے دیکھتے ساری فضایاں میں زردی کھنڈ جاتی اور بیٹائے جھکڑ طپنے لگتے۔

آندھی کا کوئی وقت تھرہ نہ تھا، کبھی عین دوپہر میں آسمان پیلا پڑنے لگتا، کبھی سر پر کروکو بھی شام کو، اور بھر سرہ پھر کا وقت مقرر سا ہو جاتا کہ بندر ہے ہوئے وقت پر آسمان میں زردی کا ایک ہالہ بنوادا، متواتا اور اس کے سلسلے میں نئے سے مٹھال ناچتی اونگھتی چیلوں کے حلقتے، مگر کسی دن باری ٹوٹتی اور رات کو سوتے سوتے فضا میں کہیں دوار ایک آندھیری آیتی اور انگنوں اور جھپتوں اور کوٹھوں یہ نیند کا یاندھا، مواظسم تیزی سے ٹوٹتا جاتا۔ کوئی زنگ مقرر تھا کہ عام طور پر تو پہلی ہی ہوتی، لیکن کسی کسی دن ایکا بھی پلاپی میں کا لوئس پیدا ہوتی چلی جاتی، اور تیسرا پھر ہوتے ہوتے آنسا آندھیرا چھا جاتا کہ دو کافوں اور مکانوں میں لاٹینیں جل جاتیں۔ آندھی سے پر کو آتی، شاموں کو آتی، آندھی آندھی راتوں کو اٹھتی، مگر اس کا تمہرہ ہمیشہ صبح کو ظاہر ہوتا کہ ٹکیوں میں کنجڑے جھٹڑی ہوئی ایسوں کے لوگرے کے ٹوکرے کے کرا آتے اور آلوں کامال ٹکوں میں بچ کر جاتے۔ کل کی کامی آندھی نے امیاں ہی نہیں ایسوں کے لدے سے چند سے تنا و درخت گراتے تھے۔ جو بیلی میں چار سپاٹی پہ ایسوں کا ڈھیر لگا تھا اور تانی اماں اور بڑی آپا کے ہاتھوں میں چاقو در در چل رہے تھے۔

”نہیں ہیں کہ ایک پتھر تین من کا شیخوں کی مٹاں میں پڑا تھا وہ اٹر گیا، اور اڑ کے ایک وحینور کے چھپرہ جا پڑا۔ ٹوپے کا چھپر گر پڑا۔“

بڑی آپا حیران ہونے لگیں ”تانی اماں شجھے تو یعنی نہیں آتا،“ پھر ضمیر سے غاطب

ہوئیں کہ اس کی سائنس واقعی پر ان کو پورا اعتماد تھا اور جب کوئی بات انہیں خلاف فحول معلوم ہوتی تو اس سے رجوع کرتی تھیں لیکن یہ سائنس بڑھی ہے تب تا و تین من لا یقین کیسی نہ کے ہے۔“

تائی اماں نے صنیلر کو بولنے کی مدد نہیں دی۔ ہم تمہاری ڈوبی ایس منیں، کو تو جانتے نہیں ہیں، ہم خدا لگن کو آرسی کیا ہے۔ بڑھیا کخبری ایسیں سے کے کل تو آ وے گی، ہی پوچھ لجھو، اسے ہم ڈوبی کی نند کا لونڈ آندھی میں اٹر گیا۔ اب تک تو ملا نہیں ہے۔“

بڑی آپا نے پھر تامل کیا لے عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ اتنا بڑا لوگوں کا اولاد نہ ہے
میں اُڑ جاوے ۔ ۱۶

”بی بی عقل میں کون سی بات آوے ہے، تائی اماں کرنے لگیں“ یہ توجہرت ہا کا خانہ ہے
بیری تو کالی آندھی کو سوچ سوچ کے بھی عقل حیران ہو وسے ہے۔ بس اس کے بھید وہی بنے
”تائی اماں“ بُنی بولی ”آپ کہہ رہی تھیں کہ کالی آندھی میں پریں ہوؤں ہیں
”بیٹھی میں تو یہ کہہ رہی تھی، ہم نے تو ایسا ہی سنایا ہے، تھے جن دیجھے جن، تھکت پر
راجہ اندر اور اور دیگر دیروں کا حلقت۔“

”تائی اماں ہبئی سوچتے ہوئے بولی ”میں بناوں لونڈٹ کے کوکون سے گیا اسے پریس
اڑا کے لے گیس۔“

بڑی آپاگرم ہو گئیں اسے دکھر کبھی بالتوں کے ملکے ڈھلنے پے بستی آرنے لیا آج ہے
تی تھدندن تونے سنت دمابے اسے ۱۰

ہنی کو جانے مانپ سونگھ گیا۔
ہنی ادھر اور ساوسیق، تحسین کی تحکماں آواز پا اور جی نہیں سے آئی۔
تھانی اماں کی بالوں کا تار لٹکتے گی تھا اور چاقوڑ بخوبیں تیزی سے چلنے کا تھا۔ اب تو
امیا میں گلہ، یہ گلہ ہے۔ ام اب آتا ہی ملا۔

«اُم تو آگئے ہیں، چنپیے ہیں۔» بڑی آپا بولیں «بوند پانی کی پڑتے تو اُم میں رس پڑتے۔»

کیراں ایسا نہیں، ایسے بھالی پڑتی، بھالی جاتی ہی اور جاتی نہ تھلی کی وضعی آسمان بدستور تابنا جواہتھا، اور اُم اسی طرح چنپیے تھے۔ اوپر سے بوند نہیں بڑی اور اندر سے رس نہیں بچوٹا، روز اسی انداز سے سورج چڑھتا اور حوالی کے ویسے آنکھ میں دھوپ اور چھانلوں کی اوریش شروع رہتی، چھانلوں بچھے ہستے ہستے نم کے نیچے سکتے آتی اور سورج مر پڑا، آجا آتا، ڈریٹا اٹھتا اور سب کے سب بڑتے کرے میں، نیم اندر حیری فضا، لہر آتا جھاڑ والا پسکھا، دروازوں پر لگی ہوئی خس کی بھیگی بھیگی ڈیٹا، آنکھوں میں اور بدن میں مٹھنڈک انہنے لگتے فرش پر پہلے دستِ خوان بچتا، پھر اسی فرش پر لیٹے لیٹے بڑی آپا اور تائی اماں اور اسی انگکھنے لگتیں، بی بی بی بی کو نہ کوڑا آنکھ نہیں لگنے دیتے، تائی اماں انگکھنے انگکھنے چونک پڑتیں، بڑی آپا بی کوڑا نہیں؟ اب تو سوئے کی نہیں؟، اور تائی اماں زبردستی اپچھے کو اپنی بغل میں لٹایتیں، ان کی آنکھیں بچر بند ہرنے لگتیں، رفتہ رفتہ فرش پر لیٹے ہوتے سب لوگوں کو نہیں آپتی، بہت دیر بعد خراٹتے لیتے لیتے بڑی آپا جو نہیں، کیا سچ گیا صمیر، «ڈھانی»، اور بڑی آپا کی آنکھیں بچر بند ہونے لگتیں، بچر آپ، ہی آپ تائی راں کی آنکھ کھل جاتی، اسی طرح لیٹے ہوئے کنوڑا ذرا کھوں کے باہر وکھتیں «دھوپ ہے ابھی تو»، اور عنودگی نہیں پھر آئیتی۔ پنکھا اسی ایک رفتار سے گردش کرتا رہتا، گردش کرتا رہتا، مگر بچر نوری کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگتے اور آنکھوں میں نیند اترنے لگتی، ایک بھیکی آئی پنکھا بند، پھر آپ ہی آپ چونک پڑتی اور بچر پنکھا ملنے لگتا، بڑی آپا سوتے سے ایک ساتھ اچھا کے بیٹھ جاتیں، کنوڑا کا ایک پٹ کھوں کے دیکھتیں اور بچر انہیں داے ہئی دھوپ چبوتری پر پنج گئی نظر کا وقت گزرا جا رہا ہے، اور اس سے کنوڑا کھوں باہر نکل جاتیں۔ آنکھ اس تکی ملتی اور کھل جاتی۔ تائی اماں اور بڑی آپا کی مانند نیند اسے کب آتی بھتی۔

پھاڑ سادن کئے میں نہ آتا اور لمبی دوپر اور لمبی ہوتی بُلی جاتی۔ باوا ایک نیند لیتے اور گاؤں کیے کے سہل سے آدمیے لیتے آدمیے بیٹھے عینک آنکھوں پر لگا پھر کاغذ پڑھنے شروع کر دیتے تجینہ کروٹ لیتی، چوڑیوں کا ایک یٹھا مد تم پھنا کا ہوتا، وہ اٹھ کھڑی ہوتی۔ ابی آنکھیں کھول دیتیں "بیٹی بچے دوپری میں قرار نہیں ہے گھری بھر کو تو آرام کر لیا کر،" مانی جی کلپ کل سے پڑا خراب ہو رہے، "ہاں کلپ پکے تو اسے بھی دھو تو سخو۔" ابی لیٹے لیٹے دوپر نہ آتا تھیں اور تجینہ کو پکڑا دیتیں۔

بندانڈھیر سے کمرے میں لیٹے لیٹے اس کامِ اٹھنے لگتا۔ آہستہ سے اٹھتا اور باہر نکل آتا۔ پیش سے ملتا والان آباد و کھانی دیتا سکرے کے دوازوں پر ملکی ہوئی پانی میں شرا بو رخ کی ٹیکیاں کر پانی اس سے رس رس کرداران میں ہتھا ہوتا، پانی سے لباس بھری ہوئی ناند جس کے پانی میں اچھے اور بنی چھپا کے رگلتے ہوتے اور پھر ایک سائچہ چھوڑ چھاڑ والان سے چھو ہو جاتے، والان کے بغلی درمیں بیٹھی ہوئی تجینہ، پاس ٹکٹے کی چیخ سے بناء ہوا کھنگی میں رکھا ہوا، ابھے میلے دوپتھے، صابون، پڑیاں اور کاغذ کی پڑیوں میں بندھے ہوئے زنگوں کے منجم ممل کی وجہی میں پیٹی ہوئی فرزوی زنگ کی قلی کہ اس سے نکلتی سنہری اہر دور سے چمک مارتی تسلی میں کاف اندر مینا اور دوپتھے کو خوب مل کر دھونا پھر کھنگاں کر تسلی میں ابلا پانی اندر مینا اور زنگ زنگ کی پڑیاں گھول کر دوپڑ زنگنا، پنجوڑ نہ، انہیں گھول کر جھکنا در آنگن میں تمنی ہوئی الگنی پر دھوپ میں پھیلا دینا۔ خربوزوں کے گود سے بھری سڑی پنڈا یا اٹھالانا اور گود سے کو اتنا ملنا اتنا ملنا کیزیچ گود سے سے الگ ہو جاتے کہ تب انہیں پتیل کی چھلنی میں طحال کر پانی کا لوٹا اٹھا تر دیرڑے دینا کہ وہ چاندی سے بچکتے گتے، پچھنچ جوں کو ہر ازنگنا کچھ کو سرخ اور ان کے ہار گوندھ دیتیں۔

کچے والان کے کسی کونے میں پٹ سے آواز ہوتی، دونوں چونک کرا دھر رکھتے اور اسی دم اچھے اور بھی جانے کہاں سے ایک دم سے داخل ہوتے اور سورج میانا نہ رُع کر دیتے

”تیلیا راجہ، باجی تیلیا راجہ... صنیع بھانی دکھو تیلیا راجہ، واقعی جلیسے تیل میں ڈوبا ہو
کالی جمکتی ڈلی سی، تیلیا راجہ مجھن کرتا دیوار سے مکرا تا، مکرا کے زین پٹپ سے گرا اور
پئے سوراخ سے تیز تیز مٹی کر دنا شروع کر دیتا تیلیا راجہ کا ہنگامہ پر ورثرا مانی عمل ابھی جاری
ہوتا کہ اچھے کی نظر بھکتی اور دالان کے بغلی در میں ایک بڑھیا آہستہ رنگتی بھکتی کھلی
پڑتی، جو دالان سے نکل انگن میں پختی اور تیرتی تیرتی اور پٹھنے لگتی، یہاں تک کہ سائنسے والی
دیوار کی مندرجہ کو چھوٹی معلوم ہوتی ”بڑیا، بنی بڑیا“، اور اچھے اور بنی دونوں دالان سے نکل
انگن میں ہوتے ہوئے تیر کی طرح زینے میں داخل ہوتے اور گم ہو جاتے۔ پھر وہی بھائیں
بھاگیں کرتا دالان اور چڑروہ اور تجھیسہ اکیلے۔ اکیلے لمحے جن کی وہ نمنا کرتا رہتا لیکن آئے پہ
وہ کتنے سخت گزرتے، ایک گوگو کی کیفیت، دھڑ دھڑ کر تا دل؛ اور تجھیسہ اسی انداز سے کویا
اسے کسی بات کی خبر نہیں گودے میں سنتے خرونے کے میلے گدے بیجوں کو ملتی رہتی، ملتی رہتی
گر پھر آپ ہی آپ اس کی گردن پہ پسیسے کے اجلے قظر سے ابھرنے لگتے اور بیچ صاف کرنے کا
شغل ایک مشینی عمل بن جاتا، لیکن اس کے ہاتھ اسی انداز اسی رفتار سے بیجوں پھرے
گودے کو ملتے رہیں گے۔ اچھا وہ بیجوں کو تڑپتے رہتی اور اٹھ کھڑی ہوتی۔ اٹھنے لمحے
کہ ایک طرف، ہوتا سے اڑتی نظر سے دکھتی چلتے چلتے بطاہر مادگی سے کمتوں ”بست پس بے بیوں
بیٹھے“ دیگر لیں یہاں؟، تیتے دالان میں بیٹھے رہنے کا کوئی عذر اس کے پاس نہ ہوتا۔ وہ چیز
پاپ اٹھ کر اہم اور کبھی اندر بڑے کمرے میں پلے جاتا اور کبھی باہر ہو لیتا۔

باہر جاتے جاتے اس نے عذر پیدا کیا۔ ”تجھیسہ۔“

تجھیسہ بھٹک کی۔

”بستے دے دو چکو۔“

dalan سے نکلتے نکلتے وہ مردی اور بغلی کمرے کی طرف ہولی تیجھنے لگتے وہ۔ پھر آپ سے
سے اندر آگیا، بغلی کمرے میں سندوق کے پاس جماں وہ پیسے نکال رہی تھی سا جلے موٹی سے

فڑے گردن پہ بھرا بھرنے لگے اور گردن پر پرے ہونے اکا دکا باں بھیگنے لگے اور ہاتھ
بلدی جلدی کپڑوں کو اٹھنے پلٹنے لگے۔ کپڑوں کے پچھے سے اس نے روپیوں کی صندوقیں نکالی
روپیہ نکال کے اسے دیا کہ وہ لمبی گوری انگلیاں اس کے ہاتھ کے بارے آگئیں اور پھیلے ہوئے ہاتھ میں
ما راستہ ایک ارادہ پیدا ہوا، ایک جنتش، مگر بچروں تی رکا دٹ کی کیفیت۔ وہ صندوق بند کر
آہستہ سے باہر نکل گئی۔

دہیز میں وہ چند لمحے چیپ چاپ کھڑا رہا۔ دل اس کا آہستہ آہستہ دھڑکنے لگا تھا۔
کھڑا رہا، پھر جی ڈھینے لگا سکرے سے نکل کر دالان میں آیا کہ اب غالی تھا اور دالان سے متواتا
ہوا باہر نکل گیا۔

صرخ پھر دل والا مندرجہ دور سے آپنے دے رہا تھا۔ بہت اوپنچائی پہاندھیری کھڑا کی
ہیں لگی ہوئی وہ لوہے کی جرخی کر مسیح و شام مسلسل گھومتی اور شور کرتی تھی۔ اب شامت تھی۔
مندرجہ الی گلی سے نکل پیدا و کی گئی سے نکل رہا تھا کہ لڑکوں کی ایک بے ہنگم ٹولی نے رستہ اس کا
روک لیا۔ کامے کلوٹے لڑکوں کے اس عزل میں گورے چھٹے لونڈے بھی تھے۔ لیکن مندرجہ
لڑکے کی سیاہی مل کر سب ایک سے ہو گئے تھے۔ بعض نے بس قمیض اتارنا کافی جانا تھا بعض
نے کہ بہت چھوٹے تھے۔ سب کھڑے اتارا پئے تیس نکلا کر دیا تھا۔ کچھ لے کپڑے اتارنگوٹ کرنا
کے جسم سے ہزار ٹھکنے کس لئے تھے۔ پچ سڑک پر کھڑے، باختروں میں چھڑیاں اور چھوڑتے
چھوڑتے ڈنڈے سجا تے شور بجا تے۔

کامے ڈنڈے پیلے ڈنڈے

کوڑی کھیت لگئے گا برے گا برسے گا

کوڑی گئی ریت میں پانی گیا کھیت میں

پچ سڑک پر رکھی ہوئی تھیں، تھامی میں ایک دو اکنیاں بہت سے پسیے کچھ دیئے، ہر کئے جلتے
سے طالبہ کہ تھامی میں بیسے ڈالو، دلبیا پکھائیں گے، ہمیشہ کی دعا کریں گے۔

نہال میں اگنی ڈالی تو رکوں نے رست جپورٹا اور وہ آگے بڑھا۔ مگر اب اس کے قدم نہیں
انہر سے تھے۔ قدم کر دک گئے تھے مرٹے اور آگے جاتے جاتے وہ پڑت پڑتا۔

شام کو دسترخوان پڑای آپا کو بھر شمیر کی فکر ہوئی۔ اُری تجینہ شمیر کو بلا کے لانا کر کھانا کھاؤ جیا۔
تجینہ رکی، پھر رک کر قریب گئی «کھانا»، اس نے آہستہ سے کہا۔

ایک اوپاری سی اس پر طاری تھی اور سروندھے کی پشت پڑھلکا ہوا تھا۔ آنکھیں اسی
طریقہ بند رہیں، آہستہ سے جواب دیا «بھوک نہیں ہے۔»، چپ۔ بھر آنکھیں کھولیں، بولا
«طبعیت غرائب ہے میری، کھانا نہیں کھاؤں گا۔

تجینہ ناموشی سے مڑی اور واپس بڑے کرے میں۔

اس کی طبیعت واقعی غرائب ہو گئی تھی۔ اُنی نے اس کی پیشانی کو بھیندا، اس کی کلائی کو
عیکھا، بولیں «پنڈاگرم ہے۔»

تائی اماں کو اُنی کے اس بیان سے لشکنی نہیں ہوئی۔ خنو مانچے اور گالوں کو جھوکے دیکھا،
بولیں «ہو کیسی بالیں کرے ہے۔ لوٹہ تو بخاریں بھجن را ہے۔»

بڑی آپا نے اپنے طریقہ مانچے اور رخساروں کو جھوٹا، انگلیاں مانچے پر کھیں، بھر لپڑا ہاتھ
گال، پر کھا، بولیں «لیلی، بدلت پیپر رام ہے۔

«میں تو جانوں ٹوں لگی ہے۔ تائی اماں بولیں۔

اجی لوں تو لگنی ہی تھی۔» بڑی آپا کئے لیئر، پد پھر لوں میں مارا۔ اپھر سے ہے برسوں
ہیں سمجھا، آیا تھا، بھوکی کے پاس بیجدا، باہمیں کرتا۔ مگر بھتوں وہ، یک دن بیرے پاس آکے
نہ بیٹھا۔ جنیں لیا بھر کر ہے پر دیس علکے۔ بھونک کیوں لے آئیں اسے۔ اُس کا جی نہیں لگتا یا نہ
«بلی بلی پہنچنے تو انسان تھا۔ تائی اماں بولیں، جب یاں تھا تو ہر دخت بڑی ریا بڑی

آپکر سے تھا۔»

«بھتوں وہ تو پر دیس میں جا کے بدلا ہے۔» بھر بڑی آپا نے تجینہ کو پکارا، تجینہ،

ارمی ایسا ہے کوئی جلدی پناہ بخٹے کے لئے۔،
بخار گرم کے آبا۔ شروع میں بے ہوشی ہوتی کرتی بدن کا ہوش نہ رہا۔ بلکہ ہوش آتا تو
خود دُعند لا احساس ہوتا کہ ہاتھوں پیرول پہ مالش ہو رہی ہے آہستہ آہستہ پھر منودگی آیتی
اور پھر وہی سیے تبری۔

دو دن غلطت رہتی تیسرے دن ہوش اگایا سوسائٹھے اس کے بخار بھی ٹوٹنے لگا۔ پسند اتنا
آبا کہ کرتا تر بتز ہو گیا اور بڑی آپامان تھے اور گردن اور گلے کو آنچل سے پونچتے پونچتے تھک گئیں۔
معاہدت البتہ اس طرح باقی تھی۔ سرخالی خالی لگت تھا اور نہ بان بہ اسی درج کا نہ سے جمع تھے۔
تائی اماں اور بڑی آپا اور امی دوپہر کی حنڈگھر بیان جانیں کس مشکل سے بڑے کرے
میں گزار تی تھیں، چھت میں لٹکے ہوئے چال روانے لبے پکے سے زیادہ انہیں یہ کی ٹھیکیوں
سے چھن کر آنے والی جواز یادہ بجا تی تھی۔ لوچنے لگتی اور دھوپ کی پیش تیز ہو جاتی تو
نہم کے نیچے سے اٹھ کر اندر جاتیں، لیکن ٹک دھوپ ڈھلی اور وہ بھرا بھی ٹھیک پہ سو
درن ڈھلاتا تو وہ تو باہر نکل ایں۔ مگر اس پر پابندی تھی کہ شام سے پہلے باہر نہ آئے۔ دلوارہ اس
انداز سے بند تھا اور خس کی ٹھی اسی طرح پانی میں شر اور تھی۔ البتہ روشنداں سے شعاع اس
بھک کے اندر چلی آئی تھی اور کمرے کے اندر ہیرے میں ایک سحری پارہ بھری لکھری تھی تھی۔
جو پتہ دریتی تھی کہ مسونج کا رخ بدل جکا ہے۔ نوری اور حی سوتی اور می جاگتی ایک جی رفتار اک
ہی انداز سے پکھے کی ڈوری کھینچنے چلی جاتی تھی کہ اس میں کبھی کبھی اس کے اذنگوں جلنے سے
تجھٹکا آتا اور ہوا کے بھاؤ اور کندوں کی گردش سے پیدا ہونے والے یکسان تر نہیں۔ ایک
پھند اپڑتا، پھر وہ فوراً چونک اٹھتی اور ڈورتی کی گردش اور ہوا کا بھاؤ ان کندوں سے
نکلنے والی آواز پھرا سی مفرزہ ڈگر پہ آ جاتی۔ تھیس نے اس کے سر میں کا ہو کے تسلیکی ماش
زور زور سے شروع کی تھی، مگر اب اس کی رفتار بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی اور نکلنے کرہ باؤں پس
گردش کرتی ہوئی انگلیاں پکھے کی نیزند بھری رفتار سے رفتار ملا کر آہستہ آہستہ سرسرار ہی

تھیں، رینگ رسی تھیں اس پر نیم عنودگی کا عالم تھا پہچلے دو دن غشی اور نقاہت کے گرم دھنڈ میں ڈوبے ہوئے دن اب پہنچے سماں ٹکڑے کر کے یاد آتے جا رہے تھے، گورے پوروں بیب خفرا میٹر کی شیشے کی شفاف نظری کراس کے ہونٹوں میں آجائی اور پھر دہ بھی انگلیاں انہیں جملک کر بلند کر میں اور آہستہ سے ایک چاندی سے جھکتے خول میں بند کر دیں۔ ہاتھوں اور پیروں پر ہوئی ہوئی مالش کہ ایک بھی رفتار سے دینک جاتی رہتی بیان دیک کہ تلوں کو ملتی ہوئی زم پوتی تھم جاتی اور تانی اماں کی کلامیوں میں پردی ہوئی پاندی کی جوڑیاں بھیں اور خاموش ہو جاتیں یا کبھی کبھی اس کی سمجھی پر گردش کرتی ہوئی زم رسیل پوٹلی ہاتھ کو ہلکے سے تھاے ہوئے تھیں میٹھی انگلیاں، ریشمیں شیریں چوڑیوں کے ہلکوڑیں سے رستا ہوا زم تر فم اور ایک خواب حواس پر اس کے چھانا ہوا، ایک شیریں غشی، ایک شہدا میز لش، وہ خیریں خوابی کیفیت پھر جاگ رہی تھی۔ لذت سے بیرزہ بلکی پتلی بدیاں حواس پر پھر امنڈ رہی تھیں جی چاہتا تھا کہ انگلیاں وہ یوسنی بالوں میں سرسراتی رہیں اور وہ یوسنی آنکھیں موندے آدھ نیندی کیفیت میں ڈوبا رہے تھے نیند بھری کیفیت کچھ گھری ہوئی شعور میں اس کے شہد سا گھل رہا تھا اور حواس پر خواب کی ایک پتلی تر چڑھتی جا رہی تھی۔ بغیر کسی ارادہ کسی نیت کے سیدھے تھے کو اس کے حرکت ہوئی اور آہستہ سے سر لانے کی درت بڑا گیا۔ کاموں کے تیل میں ڈوبے ہوئے گھنے گرم بالوں میں رینگ کر انگلیاں س کی گردش کرتی ہوئی گوری انگلیوں میں پیوستہ ہو گئیں۔ گردش کرتی ہوئی انگلیاں تھیں، جھلک کی تھاں جمی رہ گئیں جہاں کی تھاں جمی انگلیاں پھلنے لگیں، بینے گئیں۔ آگ نے آگ سے نیش پکڑی، اگر میال روک انگلیوں سے انگلیوں میں منتقل ہوئی ہوئی، نشیب سے ابھر کر نشیب میں بہتی ہوئی؛ الگ الگ بہتی نہیں کوئی کوئی کناروں پر سے بُنکلی تھیں، ایک دوسرے میں بینے لگی تھیں، گھل مل کر ایک لُخ بہد رہی تھیں۔ کاملے لمبے بالوں کی گرم گھیری سے نکل کو جکڑے ہوئے ہاتھ ہونٹوں کے قریب آگئے۔ جلتی گھلتی گوری گوری

انگلیاں بیٹتے ٹوٹتے بخار والے تپتے کا بیتے ہونٹوں پاس آ کا پیس، ہونٹوں سے نکلتے گرم سالن میں بہہ نکلیں، مگر ایکا بھی وہ بے قابو ہواں گرم گرفت کو جھپڑا کر نکلیں۔ وہ سر لانے سے ایک ساتھ بڑا بڑا اکھی اور چل کھڑی ہوئی۔

دور ہوتے ہوتے قدموں کی چاپ کے ساتھ دروازہ چلتی میں کھلا اور بند ہو گیا آنکھیں اس کی اسی طرح مندی ہوئی تھیں، مگر حواس پر چھائی ہوئی خواب کی گھری ہوتی گھٹتا پھٹتا کی تھی۔

(۳)

صحب اسکے سر برے منہ اندھیرے کھلی کہ بڑی آپا بھی نماز کی چوکی پر تھیں اور ان کی پر سورقت بھری آفاز مولا علی، وکیل علی، بادشاہ علی، صحن میں پھیل رہی تھی، رفت کی بدکیفیت کہ بڑی آپا کا جسم گچل رہا ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ وہ بے گا اور صح کے پاکیزہ دھنڈ کئے میں حل ہو جائے گا۔

گھر سے نکلنے پر کہ آج، یماری سے اٹھنے کے بعد کئی دن میں قدم باہر نکالا تھا اور نور کے رت کے شلنے چلا تھا اسے ساری فضائی نئی نظر آئی اور اعلیٰ والی مندر کہ جس کی بند درستکے والی چڑھی مسلسل گردش میں تھی، لمبی ڈوریوں میں بندھی ہوئی چھوٹی بڑی پتیل کی گڑ دیاں اور لو ہے کی ڈولپیاں کہ تیزی سے نیچے چلتیں، کنوئیں کے اندھیرے میں کم ہو کر کھنکھنا تھیں اور پانی سے لبالب بوندیں پکلتیں پھرا سی درستکے میں چھپ جاتیں، ٹھیڑروں والی گلی کہ ابھی دکا نہیں بند اور فضا شور سے پاک تھی، لیس ایک بھنگن جھاڑو دیتی تھی، جس کی جھاڑو سے اڑتی ہوئی گردنے کیلی سے ایک زم رو چیخ و حصہ کا غلاف پڑھا دیا تھا، گلوں سپرے بستی سے باہر چلتی ہوئی وہ سفید لکنگروں کی گڑھوں والی پلی سٹرک بھی جس پر پتھر ہوتے پر اس کے گٹھوں تک خلک میں اٹ پیٹھے تھے اور بستی کی انتہا پر کھڑا ہوا مترخ اینٹوں والا سڑھا تھا ستون، رات کی رخصی کا نقیب کہ اب گمراہوں میں یوں چپ تھا کہ نوحہ خوانی اور مناہی

کا فرض گویا اسے پھر اداہی نہیں کرنا پڑے گا۔ بستی کی آنکھا کو اس نے چھوڑا اور پلٹ پڑا قدموں کے نیچے سے نکلی ہوئی سڑک پھر قدموں کی زد میں تھی، کبھی لٹکر دل کی کھرد سی زمین قدر دل میں بھجتی ہوئی، کبھی ادھر سی سڑک جہاں لٹکر غائب تھے اور قدم سخنے سے خاک اڑتی تھی اسکوں والا باعینچہ نظر آنے پر سڑک سے اتر دگر ٹھے میں آیا جہاں منوں مٹی تھی کہ پیر اس کے دھنس دھنس گئے اور دگر پار کر اسکوں کی صاف شفاف پلڈنڈی پر۔

وہ ایک خاموش شہر میں داخل ہو گیا تھا۔ سُرخ زیستوں کے دنوں کی وہ بھی قفاراً وہ برآمدہ کہ کنجیا چلا گیا تھا، دور سے دیکھنے پڑتا کہ یہ عمارت ان گنت دردوں اور ایک بھی برآمدے اور کھریل کی جھکی ہوئی تھی چھت کے سوا کچھ نہیں، مگر قریب آئنے پہ مددت بلند ہونے لگتی اور پھیلتی چلی جاتی۔ اور پہنچے در، اندر حکمتی شیشوں والے ان گنت دروازے اور درپچھے کردا گرد پھیلی ہوئی فیلڈ، جہاں کہیں کہیں سفید کھجے کھڑے تھے اور ہاکی اور فٹ بال کی فیلڈوں کی سرحدوں کا پتہ دیتے تھے۔ کلاسوں کے دروازے مقفل تھے، برآمدے سے خالی اور فیلڈ خاموش۔ اسکوں بند تھا۔ شہر، جس کے دھو میں مچلتے آسمان سر پاٹھاتے۔ نیچے شہری سال کے سال، بھرت کر جاتے اور شہر خالی اور سفانہ ہو جاتا۔ ان دھو موں اور اس شکست دلوں سے اس کی آشنا فتحی بھیں گے۔ جہیں میں ابا میاں کے ساتھ جھوڑ کے کھیتوں میں گھومتا کثراس نے آنکھ بسجا کر رستہ کاٹا ہے اور بھول توڑنے کی نیت سے مکوں میں پہنچا ہے جب وہ سکول کی پست چہار دیواری کو پچاند کر اندر داخل ہوتا تو یہاں کی ہر چیز دیکھی اور برتقی ہوئی ہوئے کے باوجود وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی بستی میں محسوس کرتا، جہاں کے باسی کسی بادو کے اثر سے یا کسی دیو سے کے قدر سے بستی خالی کر گئے ہیں۔ وہ فیلڈ کا ہر لگاتا، فیلڈ میں کھڑے ہوئے سفید ستوں کو چھوڑ کے اور ہلاکے دیکھتا، خالی برآمدوں میں گھومتا۔ خالی برآمدے، بند دروازے، اکاڈمیک دروازے کا شیش لٹوٹا ہوتا اور وہ جانک کر رہا۔ تم اندر چھرے میں چکتے دیکھوں اور کرسیوں کو دیکھتا، دیکھتا رہتا اور یہ تھے ہشت جاتا، کسی

دروازے کا قفل فاش بھوتا اور دروازہ اک فردا کھلا ہوتا، جیزافی اور ٹفر کی ملی جلی کیست کے ساتھ اس کے ہاتھ کنوائر ون کو آہستہ سے کھولتے، چکے چکے اندر جاتا، تعجب سے خالی فرش کو بند در تچوں کو ادھر کھلے رہ شندالوں کو دیکھتا، پھر دل اس کا دھڑ کئے گھٹا، باہر نکلتا اور بغیر چھوٹ توڑے اس کی حدود سے باہر جلا آتا۔

ماضی کی ہمک مُسے پھر آنے لگی تھی اور بیتے دنوں کا جادو دل و دماغِ بیس جاگ رہا تھا وہ باخچے میں ہولیا دھلے دھلے پودے اور جھاڑیاں، اجھے سفید چھوٹوں گویا سبزے میں جاندنی پیشی ہے تینیاں کہ پودوں کو ہاتھ لگانے سے بے قرار ہوتیں اور ٹھٹکانے سے بے ٹھٹکانے ہو فضا میں ٹھٹکنے لگتیں۔ شبیم سے شراب پر پتوں اور مکتے چھوٹوں میں سفر کرتی انگلیاں ایک اور سفر پر نکل گئیں، انگلیوں کی گرفت میں، وہ شہد آمیز ملساں پھر جاگ رہا تھا اور پودوں اور انگلیوں اور تھیلی میں ملٹھی کی من ہو رہی تھی۔ چھوٹوں سے اس کا رہا مال مجرگیا تھا۔ اس نے دہان کو گاہٹ دی اور باہر نکل آیا۔

خاک سے اٹی سڑک، قدموں تلے بجتے ہوئے لکھر، پولی زمین، دگڑا، پکڑنڈیاں کھیتوں کی مینڈھیں، پیراں کے کبھی شبینی گھاس کو دندتے ہوئے گیلے ہوئے کبھی دگڑ سے میں چلے چلتے گردا لو رہتے۔ دور سے ہیرا کے لاپ رگانے کی آواز آرہی تھی۔ تو بھونڈ کی حدیں شروع ہو چکی تھیں۔ کبھی پیلی پکڑنڈی پر، کبھی کھیتوں کی بینڈھوں سے گزرتا ہوا وہ نیم اور سندھال کے درخواں کے پاس جا پہنچا۔ اس نے نیم کی شنی مسوک کی عرض سے توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا کہ ٹھیپوں میں سرسر اہٹ ہوئی اور گرگٹ ایک ہر سے پتوں سے نکل کر گرد سے پسایا۔ ادھر ٹولی شاخ کو چھوڑ کر وہ ایک قدم تیکھے ہٹا۔ گرگٹ چھوٹا گیا پھیلنا پیا۔ کافٹے سر کے اور پشت کے کھڑے ہو گئے اور منہ کی دھکتی ہوئی سرخی گردنیں لگوں سے پشت میں تیرنے لگی۔ دل اس کا دھڑ کئے رکا، ایک سبھم سادر کہ کوئی یورش ہونے والی ہے۔ رہنگ زرد سے سرخ، سرخ سے ہر ہوا۔ پیراں کا رخ ٹھنڈی ٹھیپوں کی طرف،

ہو گیا۔ پہلی پہلی دم کچھ دیر تک اس جگہ بھری ہوئی نظر آئی، پھر وہ بھی شک کر پتوں میں گم ہو گئی۔

ایک موہوم قدر، اکیلے پن کا سبم احساس، ذہن کے کسی گوشے میں ابھرتا و بتاؤ ہم کہ جسم کا ایک پلی خون کھٹ گیا ہے۔ رُخ اس کا پہلے کنوئیں کی طرف ہوا، پھر چلتے چلتے اس نے رست بدلا اور سیدھا گھر کی طرف ہو لیا۔ جہاں بھی کامی پسلے پسلے دالوں والی جھاڑیاں، آکھ کے پودے صفائی کا نٹوں اور میلی پنیوں اور پلے پھولوں طالے قیطر ہے میرڑھے بول کے درخت تھے۔ اب اس میدان کی شکل بدل رہی تھی۔ جا بجا سینٹ کے ڈھر تھے اور سرخ انٹوں کی دیواریں۔ کوئی کی تغیری شروع نہیں ہوئی تھی، مگر اتر آثار اس کے خاہر ہونے لگے تھے۔

جب اس نے گھر میں قدم رکھا ہے تو دیواریں اُجلی ہو چلی تھیں اور سب سے اوپر والے کوئی تھی کی ممٹی پر سہری دھوپ دکھنے لگی تھی، مگر بڑی آپا ابھی ناز کی چوکی پہ تھیں اور ان کی پرسوز رفت بھری آواز مولا علی وکیل علی بادشاہ علی صحن میں پھیل رہی تھی۔ تانی اماں دھالنگتے انجلتے ابھی سجدے میں جھکی تھیں۔ اسی طرح ساری بھی تھیں مگر اس فرق کے ساتھ کہاب پرشان کرتی تھیوں سے مدافعت کی غرض سے دو پٹے کا آپنھل ان کے چہرے پر آگیا تھا تھیز یا اٹھ بھیتی تھی پساد ہی سوتی کا دھی جاگتی تھی، بیند کی نخنی بد لیاں کہ جھٹ کر بھر گھل میں رہی تھیں اور آنکھیں مند نے لگی تھیں کہ اس نے بڑھ کر پھولوں کا رو مال اس کی گود میں رکھ دیا۔ بیند کی نخنی بد لیاں آن کی آن میں غائب، اور آنکھیں حیرانی اور استفار کی غیر واضح کیفیت کے ساتھ اس کی طرف اٹھ گئیں۔

”پھولوں میں“ جواب میں وہ بولا، اور دل اس کا دھڑکنے لگا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر دالان کی طرف ہو لیا۔

dalan میں اور خالی کروں میں معروف بن کر وہ دیر تک گھومنا رہا۔ بڑھ کرے سے میں، بڑھ کرے سے بغلی کرے میں، بغلی کرے سے بھر بڑھ کرے کرے میں۔

جب باہر آیا تو صحن اُسے بھولوں سے اجتنام نہ کہا معلوم مو۔ بچوں نافی اماں کی چاندی کی بالیوں میں تھے، بچوں بڑی آپا کے کافوں میں تھے کہ ابھی باور چی خانے کی طرف گئی تھیں بھولوں سے تحریک لدی پھنسی تھی کہ کافوں میں نہ کہتے بچوں کے اثر سے رخاؤں کے بچوں میں نگ دوڑا تھا اور چمڑہ کھلا پڑتا تھا، بچوں کے لئے سنی تھنک رہی تھی کہ کافوں میں پہنچنے پر قائم نہ تھی بلکہ ہار بھی چاہتی تھی۔

”بس اب اور بچوں نہیں ہیں۔ تجھے تو ہاؤ لا ہو گیا ہے۔“

”باجی گھرا۔“

”ذر اسے تورہ گئے ہیں۔ اس میں بھر اکیا بنے گا۔ کل بھر ضمیر بھائی لاٹیں گے تو بھر گھر بنائیں گے۔ ہیں نا۔“ تحریک کی آواز میں پیار کے ساتھ ساتھ ایک لہک بھی تھی۔
بھی کوکل کے وعدے سے تکین نہیں ہوئی ”تمہارے پاس اتنے تو ہیں۔“
”کہاں اتنے ہیں؟ پار کلینیس رہ گئی ہیں،“ اور اس نے پھیلے آنچل کو سمجھیت لیا۔
بھی پہلے تھنکی، بھر روٹھ کے منہ بچلا دیا، بھر بسوار نے لگی اور جب تحریک پر کوئی وارکار
نہ ہوا تو اس پر ٹوٹ پڑی۔ تحریک نے کہ اس نے آنچل بھر پھیلا لیا تھا اور اطمینان سے
بچوں گوہ رہی تھی جلدی سے آنچل کو سمجھا، بھی کے ہاتھ پکڑ کر بچوں چھینے اور اسے یچھے
رکبیل کے ہنس پڑھی ”باولی ہوئی ہے۔“ سر سے آنچل کا ندھے پر رکھک آیا، جوڑے
ہیں لگے ہوئے کئی بچوں افشاں کی طرح چھٹ کے گرے اور ایک لٹ سرخ ہوتے
کافوں پر آپڑھی ”ایک دفعہ کہ تو دیا کہ ایک کل ہار بنائیں گے۔ مانتی نہیں ہے۔“ وہ بھر
ہنس پڑھی ”بالکل وحشی ہے۔“

”تحریک سر مددکو،“ امی نے تهدید آمیز لمحے میں کہا۔

تحریک سنائی میں سگھی سر ڈھکا، سینے سے سر کتے آنچل کو درست کیا، کافوں کی لٹ
اوپر کی، بھر گر۔ امی نے پاندان اپنے پاس سر کایا، کھوں کے پان لگانے لگیں۔

”تائی اماں پان کھاؤ گی؟“

”بس ایک کتر گا دے جو۔“

تائی اماں بولیں، امی پھر خاموشی سے پان گانے لگیں۔ تھیمنہ گم کم، اور بنی ششدہ کہ بات کیا ہوئی۔ اور خود وہ، پیشانی پہ لپسی، حکمت کی کیفیت، گویا امی نے تھیمنہ کو نہیں اسے دیتا ہے۔

اجی ہم تو یہ جانیں ہیں، امی آخر بولیں ”کہ جب تک ماں کے گھر رہے پھر لوں کی مورت ماں کے نہ رکھنے دی۔ چوری چھپے کبھی چھوٹ مل جھی گئے تو کالوں کو چھپاتی پھر تی بختی مکبہس، اماں نہ دیکھ لیں، خوند بی لیں کی مگر اب تو چھوٹ فیشن ہیں،“

”ماں، تائی اماں یاس بھرے لجھے ہیں بولیں“ اب تو ڈوبا ہر عیب فیشن ہے۔“

”بال بے پردگی فیشن، سرکھلا رہے تو فیشن، نیچا گربہ بیان فیشن۔ دیدے چھٹے گے ہیں بڑیوں کے۔ ہمارے زمانے میں ایسا کا ہے کو تھا۔“

”تمے تو کل ہوتی سنجھا لاس ہے بی بی، تائی اماں کہنے لیں“ ہمارے زمانے میں تو ڈوبا ایسا پردہ ہو دے تھا کہ کہاں کہ عینہ مرد آواز بھی سن سے۔ بڑی اماں، اللذ ترکھنے بڑی بستی تھیں، سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ مگر سقے نے کبھی ان کی پیچھیں سیس دکھنی بی بی، ان دنوں تو ماں باپ سے بھی پردہ ہووے تھا۔ بنیاد ہلی جو ہیں ان کی ایک بہن تھی۔ بڑی بدنصیب تھی کہ بخت نہ تو چھوٹ کھنے نہ باپ بھٹے کی صورت دیکھنی لفیسب ہوئی۔ باپ باہر بیٹھا بیٹھا حکم ڈاکٹروں کا انتظام کرتا رہا، بیٹھی انہوں موت تو ڈلتی رہی۔ وہ جتنی صورت خاک کے پردے میں چھپ گئی۔ کہا اپنے کیا غیر کسی مردنے جدک اس کی نہ دیکھی۔“

تھیمنہ خاموشی سے احتشی اور با در پی خانے کی طرف چلی گئی۔ بہن بھی کچھ حیران کچھ سمجھی ہوئی اس کے تیجھے ہمولی۔

انی تھیمنہ کو اٹھتھنے اور جائے عخور سے دیکھتی رہیں اجنب وہ با در پی نائلے میں داخل

تو اس کی نظر میں پھر پہنچنے مقام پر واپس آگئیں۔

”بی بی کوئی ہڑا نے یا بھالا نے۔“ اور انی کا چہرہ غصتے سے سرخ ہونے لگا۔

”ایسی بے جوابی پسند نہیں۔“

”بڑا نے کی اس میں کیا بات ہے؟“ تانی اماں بولیں ”کوئی عین تو ہو نہیں، اور پھر ذوبیلی بات کوئی ایسی نہیں کہی۔ یعنی بات دیکھی ٹوک دیا۔ بڑوں کا کام ہی یہ ہوتا ہے،“ می کہنے لگیں ”تانی اماں میں توڑوں ہوں کہ کوئی بات اٹھی نہ لے لی جائے۔ آخر یا نی لڑ کی ہے، ایسا بھی کیا کہ نگوڑی نہ آنکھیں حیا نہ چال میں حجاب، سراور سینے کی سدھ نہیں، اب آدھ دفعہ میرجی میں آئی کہ کھوں بیٹی سی ان رڑکیاں کمر جھکلا کے چلا کر تی ہیں۔ پھر میں نے سر پا کر بھیننا لٹکھے کیا، مفت میں بڑی بخوبی۔“

”خیر یہ تو بی بی یتری خواہ خواہ کی بات ہے اپنوں میں ایسی غیرتیت تو ہوتی نہیں ہے۔“

”تانی اماں اس میں غیرتیت کی بات نہیں ہے۔ کنواری لڑکی کا معاملہ نازک ہوتا ہے۔“

”اس کی آنکھ اسے تھیک رکھتی ہے۔ بڑی آپا کے ہوتے ہم کون کہ ٹوکیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ روک ٹوک کرے۔“

”اری وہ تو اب امیاں جب سے گزرے میں لایسی بے سدھ ہے کہ کسی بات کو دیکھے ہے۔“

”ٹوکے ہے۔“

”امی چبپ ہو گئیں۔ تھالی چھالیوں کی آگے کی اور جایا کرتے لگیں۔ پھر سوچتے سوچتے بولیں۔“ اجی میں تو جانوں بڑی آپا کو ایب بیاہ اس کا کمر دینا چاہئیے۔“

”تانی اماں چپ رہیں۔ پھر آہستہ سے بولیں۔ مبنیاد علی کا خط پھرا کیا ہے۔“

”امی چون لکیں ”اچا ڈنگر نہیں کیا بڑی آپانے۔“

”ذکر کر رے گی۔ اب کے تو ذکر کر رے ہی گی۔“

”کیوں؟“ امی کے کان ٹھر رے رہتے۔

”اب کے انہوں نے ہاں اور ناں میں جواب آ لگا ہے۔ اب دُو بچھے نے کچھ تھے کرنا، ہی پڑھ سے گا۔“

چند سخے اپنی اور تانی اماں دونوں چپ پر رہیں۔

تانی اماں پھر آپ ہی بولیں: ”دُو بے وہ بھی سچے ہیں، آخر کتب تک یہ سچ میں لٹکے رہیں۔ کرنی ہے تو کرو نہیں تو منع کرو،“

”آخر سوچ کیا رہی ہیں بڑی آپا، کچھ پتہ کو پلے؟“ اپنی بولیں۔

”بی بی ہمیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اب ایساں زندہ تھے سوان کی موجودگی میں بنیاد علی کے باار بار حظ اکٹھے بر وہ چپ ہو جاویں تھے پھر ہو ہے سو وہ چپ ہے۔ اسی چپ چپ میں دن گزرے جائے ہیں اور لوونڈا کی عمر دن دن بڑھ رہی ہے۔“ تانی اماں چپ ہو میں پھر بولیں ”اب بھیتا آگیا ہے میں جانوں اس سے مشورہ لے گی۔“

”بھینے سے اور کون کون سی بات میں مشورہ لئئے تھے۔“ اپنی کے لمحے میں اک ذرا گرمی آگئی۔

”اس معاملہ میں آورڈر لے گی۔“ تانی اماں چپ ہو گئیں، پھر بولیں ”ویسے ایمانکی بات ہے کہ دُوبنی کو بھی سے عجبت تو بہت ہے۔ اندر سے یہ تھتا بھی بڑھی ہے کہ بھیسے طوں؟“ اپنی چپ انہوں نے سر دھڑکانی میں رکھ دیا، کرتی ہوئی چھالیاں بلیں، چار دانے سمجھلی پر رکھ کے منہ میں ڈال لئے۔ پھر آپ ہی آپ بولیں ”بھی بہن بھائی کا معاملہ ہے میں زیچ میں بولنے والی کون، مگر منہ یہ آئی بات تو کہی جاوے ہے؟ میں یہ پوچھوں ہوں لہ جب تھیمن کامداو سے نام دھرا گیا تھا اس وقت بھی تو یہی بھیتا تھا۔“

”ہاں یہ بھی تو تم پیغ کہو،“ تانی اماں بولیں ”مگر ایک بات یہ ہے جی بی کہ اس وقت لوڈ یا کا باپ زندہ تھا، پھر ہے چاری کی کیا طبقی۔“

انی پھر چپ ہو گئیں۔ چھالیا کرتی رہیں اپنے کرنے لگیں ”تانی اماں بات

ہے کہ انہوں نے تو نہ لے پہ چھوڑ دیا ہے اور میں بھی یہی کہوں ہوں۔ ہاں بھی سکل کلاں کو
بندہ آئے تو ہمیں تلسے کہ تم نے بھجے جہنم میں جھونک دیا۔» اسی خاموش ہو گئیں، مگر بات
کی شاید ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ چند لمحے تک کہ بھر بلوں میں، لیکن اس مرتبہ ان کی آواز بہت
بھی تھی، تا فی اماں، یہ لونڈر یا اتنی ہو تو اکیوں رہر سے ہے۔“

”اے اس کی ماں بھی دُوبی ایسی ہی ہے۔“ تا فی اماں نے لاپرواہی سے کہا۔

”تا فی اماں، یہ توہر وقت خفغانی سی رہوئے ہے۔ جانے غریب کو کیا دکھ لگ گیا ہے۔“

”تی آپا ہماری ایسی باوں ہیں کہ کسی بات کی سدھ ہی نہیں۔“

تا فی اماں نے ایک ساتھ پھلو بدلا داے ہیئے دھوپ آگئی۔“

دھوپ پھیلتے چھیلتے چار پانی پہ آگئی تھی۔

”اندر چلو،“ اسی اٹھ کھڑی ہوئیں صنیر چلو جانکے اندر بیٹھو،“

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بغلی کمرے کی طرف ہو لیا۔

دوپہر کو وہ کئی بار کمرے سے نکلا، کبھی پافی پھینے، کبھی پشاپ کے بھلنے۔ دالان میں

دالان سے صحن میں، صحن سے پھر دالان میں۔ اس دوپہر کو دالان سنان رہا، وہ دوپتھے

گئے نہ خربوزوں کے بیچ دھملے۔

چھر اس کی آنکھوں لگ گئی جب وہ اٹھا اور باہر آیا تو دھوپ ڈھل گئی تھی۔ اسی اور

اماں اور بڑی آپا سب کے سب باہر نکل آئے تھے۔

”صنیر باہر آ جاؤ، یاں ہوا ہے۔“ بڑی آپا لے اسے آواز دی۔ وہ دالان سے نکل

کے پنجے موڑھے پہ جا بیٹھا۔

”اے چھموں تو نے ٹوک دیا۔ ہوا بھر بند ہو گئی۔“ تا فی اماں کے ہاتھ میں پنکھا نہ رزور

سے گردش کرنے لگا۔

ہوا اتفعی بند ہو گئی تھی۔ اس کی قیص پشت سے تر برزاونے لگی۔

”بھینا بڑی گرمی ہے، میرا لوپنڈ امر ورثیوں سے بچل گیا،“ امی دو لیں۔
 تانی اماں بڑا بڑا نے لگیں متوہہ توبہ آسمان تو تابنا ہو گیا۔ ٹوپی بھوبل بر سر رہی ہے؟
 پھر ان کا الجرد بدلا اور گرد گرد اکے دعا مانگنے لگیں۔ الہی اپنے عیب کا صدقہ پانی بھج۔۔۔
 پانی، کربلا کے پیاسوں کا داسطہ، پانی۔۔۔
 بڑی آپا کرنے لگیں ”بھنوں، نئیں ہیں کہ بخوبیوں نے بتایا ہے کہ اب کی برس پانی نہیں
 پڑتے گا۔۔۔“

تانی اماں نے فوراً ٹوکا ”نابی بی، ایسی آواز مت نکال۔ اللہ رحم کرے۔“
 امی بڑا بڑا نے لگیں ”اجھی ہم تو یہاں آکے آفت میں پھنس گئے۔ ایسی گرمی کا ہے
 کو دیکھی سختی، ہم نے ساون گزر جیلا اور بادل کا آسمان پہنام نشان نہیں۔“
 ”اری بی بی،“ تانی اماں کا تجھیں بھکنے لگا دری کیا سوکھا ہے سوکھا تو ایسی پڑی سختی۔۔۔
 ہمارا تمہارا تو پڑتے بھی نہیں تھا، بڑی اماں سنایا کہ دس تھیں کہ ایسی سوکھا پڑی کہ برسات
 ساری گز رکھی اور بوند پانی کی نہیں پڑی۔ ساڑا جاڑا، ساون سوکھا سوکھا، بھادوں خالی،
 آسمان تابنا، زمین تڑخی جادے، چڑھیں گھونٹ کوتھر سیں اور ڈمکرالوں کو پیاس سے
 ڈکرائیں۔۔۔ تو بی بی یہ سمجھو کہ اس برس دا نہیں آگا۔ کال پڑ گیا۔۔۔ سارے میں تراہ
 تراہ پڑ گئی۔ ماں بکھتوں نے سختی بھر جنوں کے لئے گوئیں خالی کر دیں اور اک اک نولے
 کے لئے بیٹیں بھا دیں۔۔۔ وہ جانور کٹا وہ کٹا کہ اس تو یہ ہی ہے۔ چرند پرند بھوبل
 کاٹا اور کھایا۔۔۔ اری بی بی، کو ایک عنقاء مو گیا۔

”کوئے بھی؟ اسے تانی اماں کیا کہہ رہی ہو۔۔۔“ بڑی آپا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
 ”اماں بی بی کوئے۔۔۔“ تانی اماں کی آواز میں وہشت کی ایک کیفیت پیدا
 ہوتی۔۔۔ کوئے۔۔۔ بی بی کال تھوڑا ہی تھا عذاب الہی تھا۔ کال ٹھلا تو غدر لوٹ پڑا۔۔۔ چھٹے
 نہیں ہو نہیں، پھر دا کے پڑے۔۔۔ روز بھر میں اوس کے آج فلاں محلے میں کو مل گا۔ آج

فلان گاول میں ڈاکہ پڑا گیا۔ اسے میبا اسی میں عذر پڑی گیا۔ خلفت ہل گئی۔ وہ گولہ بارو دھلا کر
کھڑی جو لئیں زمین کا پہوند ہو گئیں اور چوپیوں والوں کو سرچھپاتے کو جگہ نہیں اور سیاھی میں
نوجہ رک پڑا کہ بڑی اماں کیوں تھیں کہ دلی کے کنوں میں خاک سے اٹ گئے اور جمنا سرخ ہو
گئی۔

تائی اماں چپ ہو گئیں۔ بہکتے بہکتے جانیں کوئی سی دنیا میں جانکلی تھیں کہ آفانہ بھی ساختہ
ان کا چھوڑ گئی تھی۔ بڑی آپا کم کم، انکھوں میں دمہشت کی کیفیت۔ امی بھی چپ گئے پھر بھی
انی نے پہلو بیدلا اور تائی اماں کے پورے ہوئے جادو کے جالے سے نکلنے کی کوشش
کی۔ ابھی خیر دلی کا کیا ذکر ہے۔ اس شہر کو تو فقیر کی دعا ہے۔ بار بار اجڑے ہے بار بار بیسے ہے۔
تائی اماں اس کو تکھی رہیں وہ خود بھی تو اپنے پورے ہوئے جالے میں گھری ہوئی
تھیں۔ پھر انہوں نے نیکھا اٹھایا بھلٹنے لگیں۔ پھر بڑا بڑا میں۔ فقیر کی دعا کہ لو یا احصال کی
سرزا، ہم لو یہ جانیں ہیں کہ باعیس خواجہ کی چوڑھٹ میں کوئی راجہ سورس سے زیادے
تخت پہ نہیں بیٹھا۔ سورس بعد راج بد نہیں ہے، ارہایا ہے۔

«اندر تیر اشکر»، بڑی آپا کی باچھیں کھل گئیں۔ نیم کے پتوں میں سربراہت یہیں ہوئی تھی
اور جلتے پتے بدنوں کو ہوا کے ایک ہلکے جھونکے نے چھوڑا تھا۔ ڈھلتی دھوپ سے پتے
آنکن میں اچانک چھاؤں میں اتر آئی۔ دھوپ پرتوں چلتے لگی، جلدی جلدی سانس کی دیوار
پر پڑھی، منڈپ پر پڑھی، اوپنے کو نہیں والی مٹی پر سرکتی نظر آئی اور اس کھل ہو گئی۔

«اللہ پانی بیسچ ہو بڑی آپا کی حست بھری نکلا ہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

نخنی کھلی بلیاں بلیتی بلیتی فضای میں بھکتے بھکتے قریب ہو گئیں تھیں اور کھل مل گئی
تھیں۔ کھلی ملی بلیاں بلندی پر رنگتی رہیں، تیرتی رہیں اور سوکھے آنکن میں شنا دالی کی رو
دوڑ نے لگی۔ کھلی ملی بلیاں پھیر بھٹنے لگیں اور دھوپ پلٹی، مٹی پر منوار ہوئی، منڈپ پر
آئی، دیوار دیوار انتزی، اور آنکن میں بچیل گئی۔

دروازے کے باہر بھڑکھڑک رہا کارکا۔

«اکہ کس کا آیا؟» بڑی آپا چونکیں۔

«غمیر،» ابی اس سے مخاطب ہوئیں «ویکھو کس کا اکہ آیا۔ بھر بڑی آپا بولیں» میں جلوں
تمارے بیچے آگئے، مقدمہ تو آج ختم ہو گیا۔»
وہ اٹھ کر دروازے کے طرف چلا۔

بڑی آپا دھڑکتے دل سے دعائیں انگر بھی تھیں والی خیر، اچھی خبر آئی ہو۔»
دروازے پہنچا تو باوا کے سے اتر پڑتے تھے۔ کچھ دی بالوں میں اور لباس پر گرد
کی ہلکی تر، چہرے سے سفر کی تکلی فلکی ظاہر، اسکے والے کا حاب چکایا، بستہ اتر واکر نوکر کے
سر پر دھرا اور تھکے تھکے قدم اٹھاتے اندر پلے۔ وہ ان کے پیچے پیچے۔ آنکھیں میں قدم کھا
تو بھر بھر کی نکاحیں، آس ویاس میں بیٹی ہوئی سوال کرتی نکاحیں، ان کی طرف اٹھ گئیں باوا
نے جیب سے رومال نکال کر کپڑے جھاڑے، چہرہ صاف کیا، گردن پہنچتے پسینے کو پوچھا
اور مونڈھے پہ بیٹھ گئے، ابڑی آپا مونڈھے کے پیچے اکھڑی ہوئی تھیں اور زور زور سے
پیکھا جعل رہی تھیں۔

«بھیا کیا ہوا؟» تانی اماں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ آہستہ سے بولے «ڈگری ہو گئی۔»

«ڈگری.....»

تیزی سے پیکھا جعلتا ہوا ہاتھ ایک ساتھ رک گیا۔ رک کر بھر جلنے لگا، مگر آہستہ آہستہ
کئی منٹ تک خاموشی رہی، سو اٹھے پیچے کے کہ بڑی آپا کے ہاتھ میں باوا کے
سر پر آہستہ گردش کر رہا تھا۔ پھر باوا اٹھنے اور عنانے کی طرف پلے گئے۔
وہ نہادھو کر دی روزمرہ والا چارخانے دار تحمد باندھے سقید بیان پہنچانے
سے نکل مونڈھے پہ بیٹھے اور جھٹکی نے کو کہ ابھی تازہ کر کے مونڈھے کے سامنے رکا گیا
تھا، ہونٹوں میں دبایا۔ بڑی آپا اور تانی اماں اور امی اسی طرح کم متحان بنی بیٹھی تھیں وہ صوب

وصل چکی تھی۔ چہاروں اور ہلکا ہلکا چھٹر کا وہ جس نے زمین میں دبی ہوئی گرنی کو اجھانا تھا اور بیلے آنکھ سے انجرات نکل رہے تھے۔ باوانے حفظ کی تئے کو ہونٹوں سے آگ کر کے اے جڑ سے تھاما اور فاصلے سے رکھ پھر ہونٹوں میں دبائی۔ وہ تھکن اور پریشانی کر اکے سے ازتے وقت بشر سے سے عیاں تھی وصل میں کئی تھی تھی۔ شاداب حفظ کی سوندھی خوشبو اور خواب اور گڑ گڑا ہے کے ساتھ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ حفظ کی گڑ گڑا ہے ، باوا کی بند آنکھیں بڑی آپا اور امی اور تنا فی اماں کر گم کم بیٹھی تھیں۔ خاموشی اتنی کہ اس کا دم بند ہونے لگا۔ بار بار اس نے ارادہ کیا کہ وہ آہستہ سے اٹھے اور دیے پاؤں باہر نکلے۔ مگر اس کا حوصلہ ہوا ایک دفعہ اس نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ دبے پاؤں اس دم بند فضا سے نکل جائے کرتے ہیں ایکیوں کی آواز آنے لگی۔ بڑی آپا بہت دیر سے دم سادھے بیٹھی تھیں، بند ٹوٹ گیا اور وہ گھٹنوں میں سرد سے کے آہستہ آہستہ رو نے لگیں۔ باوانے آنکھیں کھو لیں، بڑی آپا کوہ بیکھا اور پھر بند کر لیں اور حفظ کی گڑا گڑا اہمظہ اسی ہموار رفتار کے ساتھ بند ہونے لگی اہونی رہی۔

اس رات حوالی ولے سویرے سوئے، بڑا والا یمپ کے کبھی آنگن میں کبھی چھت پر کبھی کرے میں رات کے جنک دھیڑ دھیڑ جلتا رہتا تھا اور باوا اس کی روشنی میں بڑے ابا کے سیدھے باوانی کا غذات اللہ پلٹتے رہتے تھے، شام ہی سے مندا کروایا گیا تھا۔

گلی سے گزرتے نکلتے لوگوں کو گمان ہوا کہ حوالی والے آج کی تقریب پر گئے ہیں۔

(۵)

اساڑا چاڑا، ساون سوکھا، اور اب بجا دوں گز بعد ہا تھا۔ آسمان یہ کبھی کبھی بادلوں کے دل کے دل پلٹتے نظر آتے، مگر سفیدہ ھوپ سے چکتے باول سے بدلول روپی بادلوں کے

قیلے ایک سمت سے دوسری سمت میں بھرت کرتے ہوئے بے مقصد بے منزل بادلوں کے قبیلے رینگتے رہتے، رک کر کھڑے ہو جلتے، پھر رینگنے لگتے، بادل جانے کدھر سے بھٹک بھٹک کرتے، ٹوٹے پھوٹے بادل، بادلوں کی چٹکیں، چھٹی ٹوٹی روپی بدلیاں، اکا دکا نیلے گائے اور آہستہ آہستہ آپس میں پیونڈ ہونے لگتے اور سورج پر ایک بار ایک نقاپ پڑ جاتا اور وحوب کھیتوں اور میدالوں میں جلدی چلی ہوئی درختوں کو بچلانگ کروٹ بیس جا چھپتی۔

«آج تو بادل آئے ہیں، کونی راہ گیر چلتے چلتے کہتا۔

گندل آسمان کو دیکھتا، پھر روکھے لجھے میں کہتا، برستے والے نہیں ہیں،
بیلے اجلے بادلوں کے قبیلے بے گربجے بے بر سے گزر جاتے اور آسمان پھر خالی خالی نظر آتا۔

”ٹیڑھی بول رہی ہے، یمنہ آئے گا“، پھر ہمی چھنٹی کی آواز پر تانی اماں ایسہ پھر سے لجھے میں کہتیں۔

”تانا فی اماں، بونی پوچھنے لگتی“، ٹیڑھی چھنٹی کیوس ہے؟

”بیٹی پانی مانگے ہے، بادلوں کو پکارے ہے۔“

” تو بادل سے پانی پلاوے ہیں؟“، چھے کا تجھل بیکنے لگتا۔

”ہاں بیٹا، ڈوبی بدنصیب ہے، بھے کو پانی نہیں پلایا۔ ایسی بد دعاگی کہ ٹیڑھی بن گئی پوچھ میں پانی کا قطرہ نہیں جانا۔ دماغ میں بھیمد ہے، الوند پڑے ہے تو دماغ کے رستے حلقت سڑ ہو وسے ہے، پھر پیاسی کی پیاسی۔“

ٹیڑھی پانی مانگتی رہتی۔ بادلوں کو پکارتی رہتی۔ ٹیڑھی کجھی ملیک دوپری میں ڈسکارت کبھی رات کے ناشے میں پکارتی، بونریانی کی بھر صورت نہیں پڑتی۔ جلیتی پھنکتی ہو پہریاں گرد سے اٹ گئیں اور تارے کے رالوں کو جگلاتے تھے اب میلے میلے دکانی دیتے برات

برسات کے تھے، ساون کی بھڑکی نہ بجا دوں کی بجدیدی، ساون کے بستی نڈی میں ندیے کے پچھے برس لکھدھڑی بُٹھے تھے نہ بجا دوں کی جامنیں، گیلی رین سے امتحنی ہوئی سو مہی باس پیچ پیچ کرنے گھوروں سے آتی ہوئی بساند۔

روز صحیح کہ کبھی بالکل میال ہوئی اور کبھی ہلکی میل امتحنا اور عجھوڑ کی طرف نکل پانا۔ مگر اُنکے پیچے چیخے دہ کھیتوں پر قدم رکھا کر گندل اچانک سے کبھی کسی درخت کے پیچے سے، کبھی مینڈھ پر چلتا ہوا آتا، قریب، اگر آہستہ سے سرچکا کر کھڑا ہو جاتا۔ سرکار کریلا جل گیا، گندل اور ہیرا کنوں سارے صاریح و ان پلاتتے، راتوں کو چلا تے، بگردم اٹھ کر چلا تے، ٹیڑی کی پکار اور ہیرا کی تان چنگتی دوپہر دل اور شانی راتوں میں منائی دیتی، صحیح کا گجر بخت انت سنائی دیتی اور جب دھرپت ڈھل کر مینڈھ مینڈھ سرکنے لگتی تب سنائی دیتی۔ مگر زین پیاسی وی اور روؤں اور آندھیوں کا زور قائم رہا۔ گندل روز کی فضل کے جلسے کی خبر سنادیتا۔

«سرکار..... بکی اجڑا گئی..... بل سُرخ آندھی آئی تھی۔»

باوا نے خاموشی سے چینک، درست کی بھنک کارے، آہستہ سے بو۔ «اچھا، او، کمزیں کے پاس ہے نکل کر کھیت کی مینڈھ پر ہوئے۔

«بی بی، میں نے والان سے جانکر کے دیکھا، آسمان سُرخ، خون کی بوئی، منڈپریں اور دوالیں لاں لئے،

برڑی آپا کر دہشت کی کیفیت ان کی صورت اور لمحے دونوں سے ظاہر ہوئیں، اسی مان، «ہماری عمروں میں تو ایسی آندھی کبھی نہیں آئی۔»

«تابی بی، تم نے نیس دیکھی،» تانی اماں بولیں «برڑی اماں ہاں سنا یا کرتی تھیں کہ عذر سے پچھے ایک دفعے آئی تھی، ایسی سرخ کہ آسمان مانو خون خون ہو گیا اور دوالیں اور منڈپریں اور نمیں جیسے کسی نے سرخ پڑا یا مل دی ہو۔»

«بہنوں، ہم تو یہ جانیں ہیں۔» برڑی آپا کے بچے سے دہشت کی کیفیت مت گئی تھی

اور وکھ کارنگ پیدا ہو چلا تھا جب سے اس نخت ماری کو بھٹی کی نیم کھدی ہے روز ایک آفت
لوٹتی ہے۔، تانی اماں نے فرانتا یہد کی « یہ تو سچ کہو سے ہے چھپوں۔ ابا میاں کے سامنے^۱
جب شیرہ جن نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا تو انہوں نے صاف منع کر دیا تھا کہ، تم اس زمین کو
لے نہیں لگائیں گے، اس پر اثر ہے آباد نہیں ہو سکتی۔»

« تانی اماں اپ ہیں بڑی تکی۔، امی بولیں « بھی یہ تو وقت کی بات ہے۔ کام بنتے
بھی ہیں مگر ڈنے بھی ہیں۔ س سور جائے تو کہہ دو نصیب در ہے، بلکہ جائے تو افریقا وہ،
تانی اماں نے فوراً خواب دیا ہو تو تو ہماری کسی بات کو مانئی، سی نیکی، نہیں ترا حضم
انے اچھا بی بی، ہم ہی بے دوف ہیں۔، تانی اماں جب ہو گئیں۔

بڑی آپا کا ذہن بھٹک کر کسی اور طرف بالکل سوچ بھر سے بھی بیں بولیں : ابا میاں
اور ان کے ساتھ کوئی اور..... ایک خیال کہ میرلو علی ہیں۔ ابا میاں اور بڑے ابا پرشیان
سے ہیں..... پھر جیسے میرلو علی چلا نے ہوں..... حوالی کی ڈاٹ پھٹ گئی۔
..... بس میری آنکھ کھل گئی.....

تانی اماں مل سی گئیں، کچھ دیر تک گم سم خلایں تکتی رہیں، پھر پہلو بدلنے ہوئے
مھنڈ اسنس لیا، بولیں « بعضا خواب تو سچ پچ عین میں پچ ہو جاوے سے ہے ۷۷
تانی اماں خاموش ہو گئی تھیں، لیکن جب کوئی اور نہ بولا، اور انی اور بڑی آپا گم
متحان بنی بیٹھی رہیں تو پھر بول پڑیں، مگر اب کے ان کے لمحے میں تلمی بھی تھی۔ اب
اوٹھیں کو تھیں بناتے رہو، حوالی تو نینگ لگ گئی۔»

بڑی آپا نے جواب میں مھنڈ اسنس پھرا، بولیں « ہاں ہننوں، اور چپ ہو گئیں۔
کوئی تھی کی تغیری شروع ہو چکی تھی۔ تھانے پھری کا قصر ختم تھا، ابا میاں کے رقصے
پرچے احتیاط سے باندھ کر پھر کتابوں کے بھرے نکڑی کے سندوق میں ٹوٹا دیے
گئے۔ اب باوا کا سارا سارا دن بخوبی پر گزرتا۔ اپنی نے اسے بھی اس الجھر سے میں

پھنسا دیا۔ «اجی تم اکیلے کہاں تک سارے کام کی دیکھو بھال کرو گے۔ اپنی حمر کو دیکھو۔ دراڑ سے تو کٹیا سے اپنے گوئے کہ اٹھانے جائے گا۔ صمیر گھر میں بیٹھا کیا کرتا ہے کیوں اس سے نہیں کہتے کہ کام کی دیکھو بھال کرے؟» گھر میں وہ بیٹھتا بھی تو کیا فرق پڑتا۔ وہ پھری بھر دین بھائیں تھائیں کرتا اور آنکھ پتھرا رہتا اور نیم کی ٹھیکانے کی بھی تھکے تھکے ہلکو رے لیتے اور کبھی سر پیور ہاگر چہ، ہو جاتیں۔ تجھیسے بھی گھر ہی میں کبھی دالاں میں کبھی انکن میں کبھی کیا رہی پڑے، در سے جملک نظر آئی اور آن کی آن میں او جمل۔ اپنی تھیں کہ ہر دن اُنے غردن میں رکھتیں۔ اُنھیں بیٹھتے اسے احساس رہتا کہ اپنی کی نظر میں ساختہ ہیں اور خاصہ کی ہی ہیں۔ گھر سے خفتہ ہونے لگا، مگر باہر بھی سکون تو نہیں ملا۔ سیست کی جا بجا ڈیبواریں دیبوں کے سرخ سرخ ڈیسٹریکٹ کا راجہماں سے راج بھر بھر پانیں سر بر رکھا دھبیلیں دواروں کی ملٹت باتے۔ بیر ٹھی چڑھا لوں پہ پنچھے اور پرانیں خالی کرے بہت آتے۔ در وہ سرخ اپیٹوں سے لدے گرتے کہ ان کے لد پھنڈ کے جلنے کا آتا تاداں بھر بندھا۔ اسکا کم۔ بھی نہیں شمر تعمیر ہو رہا ہے۔ لگوں کے آتے جاتے فانہ۔ روڑیاں کشنا اور بیوں اور آگوں کے چلنے کا مرن، راج مزدور اُنھی اور بھی ہوتی دیبواریں؛ یہ چل پیلیں کے تیں۔ اب مہنگی شور تھا، ایک سبے سخت مرگری۔

«ضمیر میاں، سر دلیں کیسے بنیں؟»

«کبیوں؟»

بوڑھے بڑھی نے عینک درست کی، بولا: «کل جو لکڑی آئی بھی، غائب ہے۔»
«لکڑی غائب؟»

لکڑی کس نے غائب کی، ایک ایک سے پوچھا گیا، ٹھانٹا گیا۔ راج مزدور کام چھوڑ چھوڑ کر داس کے جمع ہوتے اور لگے ایک دوسرا کو تھت دیتے۔ بھرنا دا آئے شند کرتے۔ ہر دوسریک دم سے چپ ہوئے۔ انہوں نے سیدھے سیدھے سوال کئے۔ ایک راج نے

اُکھڑے اُکھڑے جواب دیے تیک پڑا، نکال دیا۔

سر دلوں اور چوکٹوں کی لکڑی غائب ہوئی۔ پھر انیسوں پہ گمان گزرا کہ کم ہیں۔ پھر سینٹ کی چند لبیاں گر ہوئیں جس کسی پتک پڑا، نکال باہر کیا۔ چوہنی کا سلسلہ جاری رہا اور راحول کو نکلنے کا سلسلہ لباہوتا گیا۔ لیکن راج مردود ہی تھے، ایک تھیل کے چھے بٹے۔ نکالے ہوئے راج پھر کام پر آنے لگے۔ پھر نکالے گئے پھر کام پر لگے اور برائی کا ایک چکر قائم ہو گیا۔

”کام اب تک شروع ہیں ہوا؟ کمال میں راج؟“

”ضمیر میاں، خزانہ؟“ ایک راج نے پراسار سے الجھے میں دبی زبان سے کہا۔

”کیا خزانہ؟“

اچی برآمدے کی نیم کھو دتے کھو دتے چھنا کا ہوا۔ سب کھو دئے ہیں میں سے..... خزانہ بچلے گا۔

راج سارے کے سارے دن بھر کھدی ہے۔ فیم کو کھو دتے رہے، لگر کرتے رہے۔ جنہوں نے کھدائی میں حصہ نہیں بیا وہ امید و دیم میں بیٹے وہاں بیٹھے رہے اور مر ضریب۔ پھر انی کا منظاہرہ ہوتا رہا۔ شام کو کھدا کہ کانسی کا دیکھا ہے، کوئی اس میں بھر سے ہیں۔ اثر فیم کو ملے بن گئیں، تائی اماں افسوس بھر سے الجھے میں بولیں ”ابی فتحت کی بات ہے اسہ بی بی نیت کا بھی معاملہ ہو دے ہے۔ میں تو جانوں کسی راج کے سخت کی نیت میں فرق نہا۔“

راجوں کی نیت کا فرق قائم رہا اور تعمیر کے ساتھ فرابی کی صورت ٹپتی رہی۔

راجوں کے بہنگم شور سے دل اٹھنے لگتا اور داں سے مہٹ کر کنوئیں کے پاس، بڑکے پڑکے بیچے آ جاتا۔ گذل کی پکا لہبیرا، اور یہ مہیرا... ہبرا ہوتا۔

”سمجھو،“

«اوے پچھوٹے میاں آپوں ہیں، کھات دال سے»

«آیا۔»

ہیرا مینڈھ بینڈھ ہوتا پک بچک آتا، چار پانی پچھ جاتی۔ بڑکے گھنے سائے
میں لیٹ کر سے گتنا سکون ملتا۔ گندل را کھ عین دبا ہوا اپلا کر پیدا، پھٹے سے نہ کر چلم بھرتا
اوپا نئی کے سہارے بیٹھ چلم پسینے لگتا۔
«فہری میاں،» ہیرا بولا۔

«ہموں۔»

«یو کو محیٰ لب تک بنو گی؟»
«بن رہی ہے۔ بن ہی جائے گی۔»
«تباکے بعد سگرے حویلی والے بیاں پر آجائیں گے؟»

«اوہ کیا؟»

«اور حیری می خالی ہو جاوے گی؟»

«خالی؟ بیاں؟»

گندل نے چل پتے پتے آنکھیں کہ بند ہو چلی تھیں گھولیں، گھنکارا، چلم، ہیرا کی طرف
بڑھادی۔ آنکھیں پھر مند نے لگیں گلنگنا نے لگا:
رات گنو ای سوئے کے دوس گنوایو کھا۔

ہیرا جنم اموں تھوکوڑی بدلو بلئے

اس کی آنکھیں بھی بند ہونے لگی تھیں اور ملھی ملھی غتو دگی آنکھوں میں آنکھوں کے
راتے پورے بدن میں اتنے لگی تھی کہ منشی جی کی آواز نے چوز کا دیا۔

«فہری میاں،» منشی جی کی آواز گھرا فی ہوئی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں «کیوں؟»

”کو میسا سوکھ گئی۔“

”کو میسا سوکھ گئی؟“ وہ حیران رہ گیا۔

”جی“ منشی جی بولے ”کو میسا سوکھ گئی۔ اب پانی کہاں سے آؤے۔ کام رکا پڑا ہے۔“
وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے کو میا کے پاس گیا کہ جہاں مختی سارے کام چھوڑ چھوڑ کر
جمع تھے، کچھ کو میا کو جانک جانک کر دیکھتے تھے، کچھ نے ٹوپیاں بنائی تھیں اور دفت
کے ملے میں بیٹھے تھے پہتے تھے، اینڈتے تھے، پھر کھڑکی طرف مولیا۔

بڑے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گیا تو باوا کی سویں نظر میں اس کی طرف اکٹھ گئیں
اور بڑی آپا بے ساختہ بولیں اسے ہئے ایسی دھوپ میں مارا ملا پھر سے پہے دیکھو تو سی
مند صرخ ہو رہا ہے۔“

باوا بڑی آپا کی بات کو نظر انداز کر کے اسے انہیں سوالیں نظر میں سے دیکھتے رہے

”کیوں؟“

”کام رک گیا“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیوں؟“ باوانے پھر اسی نئم استجواب یہ لمحے میں سوال کیا۔

”کو میسا سوکھ گئی،“

”کیسے؟“ بڑی آپا چونک پڑا۔

بڑی آپا کا سوال بے جواب رہا۔ وہ بولنا چاہتا تھا۔ لیکن باوا کے تیور دیکھ کر چپ
ہو گیا۔ باوا خاموشی سے اٹھے، پکڑے درست کئے، جوتا پہننا باہر ہوئے۔

باوا کے باہر جنے پر سکتے ٹوٹا۔ تماں اماں نے پھر برمی لی وہاے صنیر کو میا پس پر مج
سوکھ گئی کیا؟“

”وہ جی تماں اماں۔“

”کیسے سوکھ گئی؟“ بڑی آپا نے سوال کیا۔

”اگر می سے۔“

”گرمی سے؟“ تانی اماں کے لبھے میں ضر کارز بگ تھا ”گرمی سے کہیں کنوئیں سوکھا کریں
بیس۔ آخوندہ پٹ کا گناہ بھی تو ہے۔ دن رات چلے ہے ڈوب، وہ کیوں نہ سوکھا؟“
”تانی اماں؟“ وہ کہنے لگا ”یہ کوئیا تو ہھوڑے و لوں کے لئے کھدا والی بھی۔ کچھی تھلی بھی
دھنوب سخت پڑی، سوکھ گئی۔“

وہ بڑا بڑا میں ”ہاں اب بھوجی چاہے کہہ لو۔“ اور چپ ہو گئیں۔
بڑی آپا چپ تھیں۔ ابی بھی۔

بھرا جی نے جباہنی لی بولیں ”ڈوبنی کو بھی تو ایسی کھٹا فی میں پڑی ہے کہ بن بھی نہیں
جکتی روزگندت پڑے ہے۔“

بڑی آپا اسی صرح چپ تھیں۔ تانی اماں چپ تھیں۔ تانی اماں چپ رہیں، پھر بڑی
سماں سے مخاطب ہو گئیں۔ چھوٹوں بھجے یاد ہے جب پیر بھی والوں کا گھر بن را تھا؟“
”ہاں،“ بڑی آپا نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا اور پھر خیال میں ڈوب گئیں۔

”بڑی دھوم سے خردی بھی زہن، تانی اماں نثر وع ہو گئیں“ وہ تھیں کہ اللہ کی پناہ جیسے
زاں نہیں کا گھر سن رہے۔ تم کھدی۔ اسی دن کو بیا کھدی پیر بھر دوتے نکتیں باہیں۔
برادری کا ایک ایک بچے گیا، نکتیں کھائیں، بھر بھر کھلاس پانی کوئیا کا پیا۔ پانی ڈوب ایسا مٹھندا
اور سیٹھا کیا بتاؤ۔“ چپ ہو گئیں پھر نثر وع ”بی بی...“ تیسرے دن بیج کو جو سقدول
ڈالے ہے تو ڈول کھٹ سے زمین میں جا کے رکا۔ کوئیا سوکھی،“

بڑی آپا تانی اماں کا منزٹکنے لگیں۔

ابی ھھٹکر لولیں، اجی تانی اماں نیت کا بھی تو بدل لے ہے۔ بہ قلبے پیر بھی والے
بیس بھی تو اور چھے۔“

”بہ تو سچ ہے بھو، تانی اماں بولیں“ مگر بعضی بعضی زمین بھی ایسی ہو وے ہے کہ آیا د

نیس ہوتی۔ اب بیدکیہ لوکہ پیر جی نے لاکھ کو شش کی، دوسرا کنوں بھی کھد، ابا، مگر ایسی
کھنڈت پڑی کہ ڈوبامکان ہی نہ بنا۔ انہیں دونوں ڈپوت جوان جمان، یہ چوڑی چھاتی، یہ
ڈیل، مگر ڈیوں میں چٹ پٹ ہو گیا۔ اسی برس اس کی آنکھ بند ہو گئی۔

بڑی آپا چپ

انی سوچ میں پڑ گیں، پھر بھی بھی آغاز میں بولیں «خیر تائی اماں یہ تو رہنے دو مکان تو
وہ بنا ہی۔ اور بھی ایسا اچھا مکان بنائے کہ شہر میں تو اس کا تائی ہے نہیں۔»

«اے کیا بنا، تائی اماں نے بزرادی سے کہا: یہ کوئی بننے میں بنتا ہوا، مگر اجڑ گبا تو ڈوبای
گھر بنا۔ بڑا بٹاگیا، باپ گیا۔ چھوٹی نے کپاپ کا بھسوالیا۔ اب تم کہہ دو کہ شہر میں اس کا تائی
نیں بھلا کیا اس میں سر غائب کے پر لگے ہیں۔ پیر جی نے جونقشہ بنوایا تھا اس کا تو یہ اچھیا تی
بھی نہیں۔»

انی لا جواب ہو گیں بڑی آپا چپ بیٹھی رہیں، پھر انہیں خیال آیا کہ عاز کا وقت
ہوتا ہے۔

چڑا کر دن بھر دھوپ میں پتا تھا کاڑھا ہوا، پھر اس پہ پڑپاں جنے لگیں، پھر سوکھ
کر تڑپختے رکھا۔ انہماریاں کر دن بھر منڈلاتی تھیں اور پھلا سونا سمیٹتی تھیں؛ بھرت کر
گیئیں باہمے کنوئیں کا خیال چھوڑا اور نل کا بندویست شروع کیا۔ تعمیر کا کام بند، نل
ڈالنے کا کام شروع تھا پسیلے ٹھارے کے سوکھے ڈلے بن گئے، اور ہنسی دیواریں کر دوڑ
سے گیلی اور بھیگی دکھائی دیتیں میں۔ ان کی زمی غائب ہونے فلی مراج کو دن بھرا نہیں
چلتے تھے اور دیواریں چنتے تھے دیواروں کو ادھ بنا چھوڑ کر خلے گئے تھے؛ اور ادھ
بنی دیواروں پر سکوت طاری تھا۔ سوکھی کوئیا کے پاس مزدور دن بھرا کام کرتے، جماں
پہلے لمبی لمبی چھڑیں نہب نظر آئیں اور ان میں بند جھی ہوئی لمبی رسی۔ پھر وہ چھڑیں غائب
ہو گئیں اور پستہ قدر نل فسب ہوا۔ نل جلا، نل کے ساتھ کالا گیلا ہوا اور خشک اور حصی

دیواروں میں بھی کی رو بھر سے دوڑی اور انجمنا ریاں کہ لگارے کو سوکھا دیکھ کر مل گئی تھیں اور
کبھی نہ کے پاس کی پیلی پاکیزہ یکھر پر منڈلاتیں اور کبھی لگارے سے رسکھنچتی دھائی دیں۔
تل دن بھر شور کرتا اور دن بھر دیواروں پر کھٹ کھٹ ہوتی رہتی، اور دن بھر کبھی
تاڑہ تازہ بھی ہوئی دیواروں اور سندھی خوبیوں والے کمر دن میں جماں بلہ اسی طرح پڑا تھا
گھومتا، کبھی اس کھڑاگ سے بیڑا ہو تھا کہ کر بڑ کے درخت کے تنچے آجائنا اور پھر اینٹوں
اور رودھیوں اور نہل کے شور سے دور چاؤں اور سکون اور گندل کی چلم سے نکلتی ہوئی خود
آمیز رگڑا اور بند ہوتی آئیں۔

رات گنوائی سوئے کے دوس گنوایوں کھانے

، یہاں جنم امول محتوا کوڑی بدلو جائے

، یہاں اپنے پھٹے ہوئے بیڑوں کو دیکھتا۔ ان سکلیبوں اور ہمچیلیبوں کو دیکھتا کہ چرس کی
رسی کی رگڑ سے سرخ ہو گئی تھیں، چل گئی تھیں اور کئنے لگتا "گندل، کہا اچھا ہے ایشور
کی، اب کے ورشا ہوگی؟"

گندل کھانتا اور چلم پینچے آگاہ

، یہاں اچبب بیٹھا رہتا اور بھر آپ، ہی آپ بڑا نہ لگتا۔ اچھا سادن بیسو، ایک

بار بھی آھانیس پڑھی،

بنی اور اچھے حویلی سے انکھ بیٹھا کر نکلتے اور دوپھری بھر بھوڑی میں منڈلاتے رہتے
اپنک سی سمت سے نووار ہوتے اور دور سے آواز رکھاتے "خیر بھائی، دیکھو، ہمارے
پاس بڑا یا۔"

"بڑا یا بڑا یا اللہ میاں سے میرا سلام کیوں"

"اور میرا بھی، اچھے مکڑا رکھتا۔"

"بڑا یا بڑا یا اللہ میاں سے میرا سلام کیوں اور اچھے کا بھی۔" اور بڑا یا بنی کی ننھی منی

پسلی سنبھل کر فضای میں تیرنے لگتی۔

وہ انہیں ڈانٹنے لگتا، کہاں پھر رہے ہو وہ صوب میں..... ادھر آؤ۔“

دونوں کے دونوں رکھتے ایک دوسرے کو لکھیوں سے دیکھتے اور پھر انکے بھائی
پڑتے ”ضمیر بھائی تم گھر جا رہے ہیں۔“

ہنی اور اچھے نظر وہن سے او جھل ہو جاتے۔ وہ اپنے کام سے لگ جاتا۔ پھر وہ
بڑکے پسچھے چار پانی پر آ لیتا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں کروہ پھر آن وار دہوتے،
مگر اس مرتبہ ڈرے ہوئے آنکھوں میں دمہت۔

”ضمیر بھائی گر کر کینٹا۔“

”ہاں“ اچھے اشارے سے بتاتا ”لکھنڈاں کے پڑپہ مسرن ہو گیا ہمیں دیکھ کر،
تو گھر نہیں گئے تھے۔ وہ انہیں گھر کے دیکھتا اور دونوں کے دونوں اپنی بلکہ پر
بسمحہ ہے جاتے۔

پھر وہ انہیں پھر پیس کے ٹھرے کے چلتا۔ کبھی مینڈ ہو پہا بکھی بیکھی میں، اور کردا، پھر
یک سر دک، سڑک سے بکھوں میں، بھیشوروں کی گلی، پھر بنزیما، پھر پیاوہ کی گلی، پھر لال مندر،
پھر گھر آ جانا، پتا آنکن، سنسان دالان کے کسی کسی گوشے میں کڑلوں کے قرب بابا کا بابر
بھنبھنا رہی ہوتی۔ دل کہ اندر قدم رکھتے ہوئے ذرا ذرا دھڑکتا پھر ڈوبنے لگتا اور
وہ پھر اُنثے پاؤں بھولڑ کو ہولیتا۔

(۶)

کو محظی کی تعمیر جاری تھی: رک کر متروک ہوئی، متروک ہو کر سکی، رک رک کر
جاری رہی۔ باسا کا اندازہ اک ذرا غلط ہو گیا تھا، مدت اور لگت دونوں کے بارے

یہ اگنے سے وگنا خرچا جا چکا تھا اور تعمیر متحی کہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی تھی۔ تعطیلات اس کی ختم ہو رہی تھیں۔ تعلیم کا اس کا سلسلہ جاری رہے گا کہ ختم ہوا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں تسلیک پیدا ہو چلا تھا۔ امی کی باتیں بھی معنی خیز تھیں اور باواکی خاموشی بھی۔ میں نے مختلف موقعوں پر مختلف اجھوں میں بات کی لیکن مرکزی نکتہ ایک ہی تھا۔ تانی اس سے کہہ رہی ہیں، اجی تائی اماں پڑھائی تو بی اے پہ ختم ہو جاوے ہے ہوئے ایم اے کی تو بس خیم ٹام ہے میں تو ان سے یہ کہہ رہی ہوں گے بس کرو بی اے کر، تی لیا ہے تو کری جیسی قسم میں ہے مل جاوے کی نخت مارے ایم اے سے کیا مرخاب کا پرگ جاوے گا، اسے سمجھانے لگتیں «بھیسا اس پڑھائی گو طاقت میں رکھوا درکچھ کرو۔ باپ کی پیش ہو گئی تعبیف کا وقت ہے۔ اسی وقت کے لئے تواولاد مانگیں ہیں کہ پیری کا سہارا بنے وہ کمانے ہم کھائیں مگر تمہاری پڑھائی ہی ختم نہیں ہوتی۔ پچھے تو ہو نہیں کہ تباہ ہر بات سمجھائی جاوے سے خود بھی غور کرو، حالت کو دیکھو۔ مقدمے میں اتنی رقم کھلیاں ہوئی اور پریلی ہمارے پیچوڑے ہے۔ نگوڑی کو بھٹی بیسے لئے جا رہی ہے اور پوری نہیں ہو چکتی آمد فی ہر طرف بند ہے، خالی پیش ہے۔ پڑھائی کا بوجھ کیسے اٹھا ویں گے، امی کہتی رہیں وہ سنتا رہا، باوانا موٹی رہے، پھر لوئے، مگر نہ منثورہ نہ دلیل نہیں، دلوک بات پڑھائی بند کرو، نوکری کا بند و بست کرو۔»

باواکی رائے تھی کہ وہ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائے، کالج سے سرٹیکٹ لے، ان کی چھیاں سے کہر مختلف افسروں کے پاس کر کچھ کے وہ ممنون احسنتے اور کچھ پر ان کے احسانات تھے جائے اور نوکری کا معاملہ کرے مگر امی کو یہ کایک خیال آیا کہ جویلی سے کوئی میں منتقل ہونا ہے، یہ کام ایسے آدمی کے بس کا کیوں نکرے ہے۔ بات باواکی سمجھیں آگئی۔ روانگی اس کی دو دن کے لئے ملتوی ہوئی اور مکان کی منتقلی وقت سے پہلے نزد عہدوگئی۔

رات دیر کو وہ جاگتا رہا۔ تماں اماں عشا کی نماز سے فارغ ہوئے آنکھیں پرے سے ہوئے کھرے چھپر کھٹپہ آیتیں اور اپنے اور بنی کے پے دوپے مطالبوں پر خاک بسراوارہ دھن شہزادوں اونا مراد شہزادوں کے قصے نالے لگیں۔ کہانی کسی منزل پر نہ پہنچی تھی کہ بنی سو کئی چھڑا چھے کی آنکھیں بھی بند ہوئے لگیں۔ تماں اماں کہانی کہتیں رہیں اور جب سننے والوں نے خراشی لیتے شروع کر دیے تو بھر ان پر بھی خنو دگی طاری ہونے لگی۔ باوا کہ لاست کو فرخت اور اسیناں سے تمہارا درملل کے کرتے ہیں مژوڈ ہے۔ پہنچتے گھنٹوں خاموش حقر پیٹے رہتے نکھٹے اور اسے پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کس وقت چار پانی پر لیتے ہیں اُج اُس کے سامنے اُٹھتے، حفظ الگ، رکھا اور چار پانی پر لیٹ گئے تھیں نے آہستہ سے اُٹھ کر لاٹھیں بندی کی اور اسی آہستگی سے بھرا بینی چار پانی پر جائی۔ رات بھی چلی بھتی تارے سے گردیں اُٹیں میل کوڑیاں، ہلکد، اجل، گئے تھے۔ آڑ بڑی آپا بھی کہ عشاۓ کے وقت سر لے کر اب تک خماز کی چوکی پر ایک پھلو بیٹھی تسبیح کو گردش دیتے جاتی تھیں چوکی سے اُٹھیں۔ لاٹھیں کی لومندی ہوتے ہوئے بھجنے لگی تھی کہ انہوں نے بڑھ کر بھی تیز کی، مگر فوراً ہی وہ چھرمدی ہونے لگی۔ لاٹھیں استول سے اٹا کر کان کے قریب لاٹے سے بلایا، تھیس کو آواز دیتے ہیں لگیں (تھیس،

”بی“

”لی بی تیل نہیں تھا لاٹھیں میں؟“

”وڑا اللو تھا“ وہ رک کر آہستہ سے بولی ”مگر بُتل میں تیل ہی نہیں تھا، ذرا س تھا۔“

بڑی آپا نے لاٹھیں کو سٹول پر رکا، بڑھ رانے لگیں ”لاٹھیں تو جاری ہے، اب رات بھر

اندر ہیرے میں پڑے رہو۔“

رات بھیگ کر خنک ہوئی، رات کہ بھی کی روشنی کے داع غ دعسوں سے پاک تھی۔

بے میل، بے داع اندر ہیری رات، تماں اماں کے خراشے، اب شاید بڑی آپا بھی سوگئی

تھیں، اس کی آنکھیں بھی نیند سے بوچھل ہو بند ہونے لگیں۔
آنکھ کھلی تو پھر وہ می روزمرہ کی فضنا، برٹی آپا نماز کی جو کی پہ بیٹھیں ہوئیں، وہی پُرپُر
وقت بھری آواز

مولانا، وکیل علی، بادشاہ علی

اس کی آنکھیں بچپر بند ہوئے لگیں، اسے رنگا کہ نیند کی انفیم سے رنگا کی آواز آہی ہے۔

شیوہ اگرچہ اپنا نیہ وعظ و پند ہے

پراس کوس رکھ اسکے کو تو کچھ دلو مند ہے

کیا ہے جو عصر تنگ ہوا کام بند ہے

دل جمع کر کر تھت مولا بلند ہے

یعنی کرم خشار ہے خسلکن علی

مولانا، وکیل علی، بادشاہ علی

می نے اسکے جنگجوڑا، فخر ایخو، کام کے دن تو سوپرے اجتنب جایا کرو، روز وہی بارے بجے
ہے۔ سنا ہا، ڈوبی نیند فرہوئی ایتم ہوئی، وہ لیٹھے سے اک دم ایخو ٹھٹھا ہوا۔ آنکھ کھول کے دیکھا
تو بھگن کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔ پہاڑانہ دنیا مجرما کا سٹ کھاڑ کر کر داں، کو ٹھٹھلپوں میں بند
تھا۔ اب تھن میں اس کا اڈنگ رنگا تھا۔

برٹ سے باکی بیٹھک بھی کھلی۔ سڑخ اور سرمنی چلیں کہ بعض یہ سہری بعض پہ وہیں
ہائی جالی کھدی تھی۔ اسی پرانے قریبے سے چنی رکھی تھیں۔ ان پر گرد کی تکچھ ریا دہ
دیز ہو گئی تھی۔ پتیل کا چمکتا اکا لداں، کرنے میں رکھی ہوئی لام کی شکل کی چھڑی، لمبا چوڑا
تخت، تخت بہابھی چاندنی اور قالیں اور گاؤں تکڑے تخت کے برابر کونے میں رکھا ہوا تھا۔
تھا اور ڈاٹ والی جھیٹ کے کندوں میں نٹ کا ہوا بھاری جمالہ والا پنکھا کہ ساکت اور
ساکن تھا، پر لگتا تھا کہ اب میاں ابھی آئیں گے۔ گاؤں تکڑے سے کرناکے بیٹھیں گے۔

اور جمالروالا پیکھا حرکت میں آئے گا اور اس کی بھاری جمال سے نکلتی ہوئی ہوا بینجک کے دنے کونے میں پہنچے گی۔

«تائی ماں،» بڑی آپا اُداس لجھے میں تائی ماں سے خاطب ہوئیں «ایسا لگے ہے کہ ابا میاں ابھی اٹھ کے ذرا مسجد نکل گئے ہیں۔» بڑی آپا چپ ہو گئیں، ان کی آواز بھرگئی تھی بھر ان کی آنکھیں مجھگینے لگیں پھر وہ آہستہ سے باہر نکل گئیں۔

زنگ لگے برتن اور دیکھ چلے ٹوکرے کا غذ کرم جانے کی برسوں سے انہیں ہوا اور دھوپ نہیں لگی تھی، بڑی کیرا بلگی پوتا کیں کہ چٹکی مار سے تار تار ہونے لگتیں، بزرگوں کی نشانیاں اور گاریں کہ پشتیوں سے صندوقوں میں بند تھیں اور خود رکھوالي اور وارثہ میدار سے ان کے خود مرتھے، اب یہ سب کی سب و ولست اندر ہیرے کمروں اور مففل صندوقوں سے نکل کر مجن میں آگئی تھی۔

«اے بڑی آپا تمہیں کیا ہو گیا ہے، اسی کمروں اور کوئھڑیوں کا جائزہ لیتے لیتے باہر آئیں، بمال اور چڑھے اور بہاس گرد سب پہاڑی تھی اور پسیتے سے بھیگ چلی تھیں، بڑی آپا کو فراخٹ سے بیٹھا دیکھ کے چونکیں، اے بڑی آپا تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میسے بیٹھی ہو جیے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ اپنے سامان کی خبر دونا، کب نکلے کاکب جائے گا۔»

«بی بی میرا کیا ہے، تم اپنا سامان نکالو، بڑی آپا خداک سے لجھے میں لو لیں۔

«اے ہے یہ کیا بات ہوئی؟، افی ننگکیں۔

«بات کیا ہوئی بڑی آپا نے اپنی داشت میں لجھے میں بڑی معروفیت پیدا کی تھی مگر اس سے میرا سامان اچھا ج کا نکل صاف عیاں تھا، تم اپنا سامان نکالو، بھجو اون۔»

«اوہ تمہا را سامان؟، افی نے تک کر پوچھا۔

«میرا سامان نہ جائے گا۔»

«کیوں؟، افی کے جیسے تئے لگے گئے ہوں۔

با و اسلام کے انبار کے پاس کھڑے چیزیں درست کرتے تھے۔ انہوں نے مرکے دیکھا
چہرہ سامان کو چھوڑ آہستہ سے قریب آئے۔ اسی فوراً ان کی طرف مخاطب ہو گئیں "سن رئے ہو
جی، بڑی آپا کہتی ہیں میرا سامان نہیں جاتے گا۔"

"کیوں؟... کیا بات ہے بڑی آپا؟"

"میں نہ جاؤں گی، بڑی آپا نے قطعی انداز میں جواب دیا۔

"امی چیپ رہا و اچیپ رہے، پھر لوئے آخ کیوں؟"

"کوئی زبردستی ہے تم جاؤ، اللہ تیرتیں نیا گھر بنا رک کر رہے ہیں تو نہ جاؤں گی سا۔

"تمانی اماں دیکھ رہی ہو۔" اسی نے اب تمانی اماں کے الصاف چاہا۔

تمانی اماں جھٹکی کے انداز میں بولیں "مےے چھوٹے سمجھے کیا ہو گیا ہے: بیرونی خوب

ل کر کہ نیتیں جاؤں گی۔ تو بی بی نیک جاؤں گی تو یاں اکمل دلوں سے سر پھوڑو گی؟"

انی نے فوراً لکھا گایا "اور تمانی اماں اکیدا بھی یاں کون رہنے دے گا؟"

اجی میرا رہنا زندگا ہے کالے رسمیت پرائے گھر کی ہے۔ دلوں کی بات ہے:

تمانی بنیاد علی ابا و بیں تو چار بول پڑھواوں اور گھر سے دعا دوں: ہنسے سوتانی علی

کے، بلی بڑی ہے سماجھی علی باؤسے گی۔ رہ گئی میں سو آئے دلوں سے کھوں گی کر بجا

بے کو بھٹکی دے دو۔

"بڑی آپا کیسی باولیں کی با نہیں کر رہی ہو۔" اسی عصت کرنے کرتے سمجھانے پہ آگئیں

یہی بات کرو کر سمجھے میں آؤے اپنا گھر ہوتے ساتے بعد دوسروں کے سر پڑنے کی توں

کے کو کوٹ نہ ہوا۔

بڑی آپا اس سے مس نہ ہوئیں۔ انی، تمانی اماں، با و اس ب جب انی نے پہلو بدلا اور

ل سے مخاطب ہو گئی "ضخیر بڑی آپا کا سامان نکال۔"

دونا میرا سامان نہ نکھلتے گا۔، بڑی آپا نے قطعی انداز میں کہا۔

”مگر کیوں؟“ باوانے اسے قطعی انداز میں سوال کیا۔

”بس میں بیان سے نہ جاؤں گی“ بڑی آپا بھی آج باوا کے مقابلے میں جگئی تھیں۔
”آخر کیوں جاؤ گی؟ وجہ؟“ باوا کا مجر درشت ہو گیا۔

”نہیں جاؤں گی۔“ بڑی آپنے ترک خ کر کہا، مگر فوراً ہی آواز میں دکھ پیدا ہو گیا
”اب تو میرا جنازہ ہی یاں سے جائے گا... اب امیاں کی آنکھیں بند ہوتی تھیں، میری
بھی...“ بڑی آپار و پڑیں، پھر حکیماں لینے لگیں۔

باوا آہستہ سے سر کے اور پھر سامان کے انبار پر آکے چیزیں درست کرنے میں مشغول
ہو گئے۔

”ضمیر“

”بھی۔“

”ایک بھیلا تولد گیا ہے، اسے لے کر جاؤ“

وہ باہر نکلا تو سچھ دروازے پہ بھیلا اللد اکھڑا تھا اور بنی اور اچھے بے صبری سے
ٹھیلے والے کے پاس آتے، تڑا یا فی رگاتے کہ چھو، پھر اچھے جلتے اور اپنی پوری طاقت
سے ٹھیلے کو دھکیلنے کی کوشش کرتے۔ مذکون کے سرخ ہونے جا رہے تھے، مگر خیلان
سے مس نہیں ہوتا تھا۔ اس کے کھپوٹھیے والے نے پھر بیرونی اور خانہ دارے باڑے
سے لدا پھنڈا جویں سے کوئی ٹھیلے کو روائہ ہوا۔

ٹانڈے باڑے سے لدے ٹھیلوں کا دن بھرتا نہ بندھا رہا۔ پھر پھر سامان جویں سے
لانا اور کوئی ٹھیلے کے برآمدوں اور کوئے کمروں میں کیوں کیوں کی دیواروں کا سکفت بھی نہیں
سوکھا تھا۔ اڑیسا، ہر ٹھیلے کے آگے آگے ناخنے نقیب بنی اور اچھے کو سختی قریب آتی
تو آگے جا کر ٹھیلے کی آڑ کا پورے جو نش سے اعلان کرتے اور ضمیر بیزاری سے پیشوائی کر
باہر نکلنا اور سامان اتر واتا بنی اور اچھے ٹھیلوں کے آگے آگے نقیب بن کر چلتے۔

بھی ان کا ساتھ چھوڑتے اور کبھی کو محظی کے زینے پر ہوا و بھی چھت پر کھڑے ہو کر منادی بخت اور کھیتوں سے پرے سڑک پر ریگئے ہوئے مخلیے کو دیکھ کے غل چلانے لگتے ہیں جیلا آرا ہے۔ صمیر حاتمی جیلا آرا ہے، اور جب جیلا کو محظی کی حدود میں آ جاتا تو چھت سے اتر کر باہر نکل اس کی پیشوائی کرتے، کبھی نقیب، کبھی منادی، کبھی پیشو، پھر اس پورے دھنے سے جی اچٹا اور ایک بڑیا کپے تجھے کہ بندی پر بستی جلی جاتی تھی ہوئے اور دوڑنکل گئے۔

میز میں، کرسیاں، پنگ، چھر کھٹ بڑے بڑے رنگ، مقفل صندوق، کوئی اچجنی پیشیری، کوئی لوٹا جھوٹا گڑ ولنا، دیگ دیگے، کوئی لمبا بانش انہل سبے جوڑ پائے پیشیاں اور نواڑ کی جگئی، بانوں کی بچاندی، ساتھ میں ایک جھنگا، ٹین کے خالی لکنٹر، چھوٹے بڑے پرانے ہمکے ہوئے اور تھے چکتے ہوئے ڈبے، طوطے کی تصویر والی پالش کی خالی پیشیاں بظاہر بے ناہدہ پر سامان کا ہاتھ اعدہ حصہ، ایک اڑنگ تھا کہ پرآمدے کی چھت سے جلاگا تھا۔ اسے خفغان ہرنے لگا۔ سامان اس کے سر پر چڑھا اور مل تھا۔ پرآمدے سے باہر آیا، پھر کنوں میں کی طرف نکل آیا کنوں رکا ہوا تھا، من خشک، بیل ایک طرف کھڑے اونگھتے تھے اور گندل بڑے پرڑ کے نیچے اکیلا حصہ پیتا تھا۔

«گندل آج کنوں نہیں چلا ہے»

«نہیں میاں گندل بولا، چرس کو کٹو کر گئی، چو، مو سے تھی، ہیرا گھٹائی کرنے گیہے»

گندل نے اٹھ کر چارپائی مٹالی، چھوٹے میاں، بیٹھ جاؤ،

ضمیر بیٹھ گیا، گندل نے راکھ سے اپلا کر دیا، چھٹے سے توڑ کے چل میں بھرا، وال سے اٹھا تو ضمیر کے قدموں میں آبیٹھا۔

«ضمیر میاں کب جاؤ گے؟»

«وکل،»

گندل سوچ میں پڑ گیا، پھر اس نے چلم کا گھوٹ لیا پھر لو لا، ضمیر میاں۔۔۔

داؤ کے بعد جدروں ڈپٹی بن جادو تو گندل کو اپنے دھور سے بلائیے لجو،“
ضمیر چپ میٹھا رہا۔ گندل بھی جواب کا منتظر نہیں تھا۔ آنکھیں بند نہیں ہوتی تھیں
ہاں ایک خواب کی کیفیت ان میں پیدا تھی۔ اس کا لمحہ اداس ہو گیا ”چھوٹے میان، اپنی
دینی میں سکتا نہ تھا، ہڈی نے اس چھوڑ دیا۔ اب میان کی آنکھ بند ہو گئی نہیں تو میں
اب پلشن بے لیتا..... یو شرپ کام جو لا نیں ریو، کچی مٹی کا دربار ہے، اوپک بوجھ پڑا تو
ڈھے جاوے گا، وہ چپ، ہو گا اس کی نظر میں اس پاس کی چیزوں سے ہڑ کر سامنے
کے کھیتوں میں پنج گئی تھیں، جہاں پڑم دھہریاں یہ دھوپ چھاؤں کا جھیل ہونا تھا۔
جلد ہی جلدی چلتی ہوئی دھوپ، اس کے پیچے دوڑتا ہوا سایہ، ابر کی ایک ہلکی چادر کھیتوں
میں سمجھلیتی چل گئی اور دھوپ کھیتوں سے پرے کے سڑک پہنگ دھڑکنگ لوزیوں کی
ایک لوٹلی کہ منہ پے کالونس مل رکھی تھی اور ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے سے بجاتے
ہو۔ تھے زور زور سے گاہتے ہوئے۔

کام لے ڈنڈے پسلے ڈنڈے
برسائے گا برسائے گا کوڑی کھیت لگائے گا
کوڑی گئی ریت میں پافی گیا کھیت میں
”بادل اکر۔ تھے ہیں لگتے تو ہیں برسنے والے سے، اس کے لمحے میں اس اور شک
کی ملی جانی کی نہیں تھی۔

گندل دیر تک آسے ان کو سکنا رہا، پھر شک بھر سے لجے ہیں بولا، پورب سے اٹھے ہیں
کیا خر سہ برس، ہی بڑیں،“ پھر فرماں اس کی نظر، بادلوں سے ٹیکے، اور کوئی کی سب
سے اور کی اس منڈپ پر جائیں جاں بنی اور اچھے کھڑے۔ سمجھے بنی نے چکنی فضایں لیندک
”بڑیا بڑیا اللہ میان سے میرا مل م کیو،“ اور میرا بھی، اپنے نے ٹکڑا رکھا۔
”سڑیا بڑیا دلوں کا سلام اللہ میان سے کیو،“ اور بنی کی چکنی کھلی، کالا بڑیا اچکنی سے

نکل فضایں جئنے لگی، او پنجی اُٹھنے لگی۔

گندل بڑبڑا نے رکا «یو ما لکر نے گھنی راڑھ چایو ہے»، پھر حپا یا مدد جی منڈ برسے پرے کو ہو جاؤ وو۔»

بنی اور اچھے منڈ برسے پھت پر کو دلتے۔ او جھل ہوتے پر فواہی پھر اچھے، نخے دوسرکہ منڈ برسے کے تیچھے سے دم کے دم میں ابھرے اور پھر او جھل ہو گئے۔

گندل نے پھر چلم منڈ سے رکالی پسے کھیتوں میں وہ نکلا رہا، پھر گھر راگر ٹڑکی نہیں بھری آواز اس کی آنکھوں پر اس کے پورے جسم پر عمل کرنے لگی۔ آنکھیں مند نے لگیں اور سورا درمنید میں ڈوبی وہ آواز ہوئے ہوئے پھرا بھرنے لگی۔

رات گنو ائی سو شے کے دوس گنو والو کاٹے

ہیرا جنم امول سختو گوڑی بدلو جائے

بڑی آپا جنیں روتے ہچکیاں لیتے چھوڑ آیا تھا، تھینہ کر کروں سے سامان نکلنے وقت دور سے نظر آئی تھی۔ چُپ چُپ کھوئی کھوئی سی، وہ خیالات میں گم دیتے کب بیٹھا رہا، پھر ہڑ بڑا کر اٹھا، اٹھ کے کوکھی ٹکی طرف ہموڑا، جہاں سامان کے آئے کا سلسلہ قائم تھا ان جا رہا تھا اور سامان ابھی بہت آنا باقی تھا۔ بھیلوں کا ایک تار بندھا ہوا تھا کہ لدرے کے پچھلے رکتے ریٹنے آتے اور نای ہو جلدی جلدی شور کرتے واپس ہو جاتے۔ جویں ٹھالی ہو رہی تھی کہ شہر خالی ہو رہا تھا وہ فکر میں پڑ گیا کہ شام تک سارا سامان دکریا تو کیا ہو گا، کل تو اسے ہر حال میں چلے جانا ہے اسے اپنے بلتے کا خیال آنے لگا جویں کہ اس کے میں ماضی کی اڑتی خوبیوں کی مانند ایک خواب کے ذہن سے فبرنے لگی۔

اب سخراں پہ سوار تھا۔

داستان

جلگھر جے
گھوڑے کی ندا

جلگرہ

عدالت علی نے حستے کی نئے موڑ کر حکیم جی کی طرف کروی۔ پھر لمبی سی جاہی لیا، بولے
 ”حکیم جی رات اب کچھ بیوی ہونے مگی ہے“
 حکیم جی نے حستے کا گھونٹ لیا، بولے عراقیں اب تو لمبی ہوتی ہی پلی جائیں گی۔ موسم
 بدل رہا ہے،“

”جاٹے سے آہی گئے سمجھو، حکیم جی“

”ہار ابس یہ سمجھو کر اگلے چاند سے چرپائیں اندر پلی جائیں گی۔ اب بھی فخر کی نماز کے
 لئے جب میں وضو کرتا ہوں تو پانی مختبر الگتا ہے۔“
 غنی بولا۔ ”حکیم جی آب سے داستان سئتے ہوئے بہت دن ہو گئے۔“

صدیق اور نصیر نے بھی تایید کی ”ہاں حکیم جی بہت ہی دن ہو گئے داستان سئے ہوئے۔“
 حکیم جی نے مختبر اسالنس بھرا، بولے، یار دا ب تو ہم خود داستان ہو گئے“
 سب ذرا چبید ہو گئے۔ عدالت علی بولے ”حکیم جی، ہم کیسے پلٹتے ہیں۔“

”میاں دن بیت گئے۔ اب کیا یاد کرنا اس وقت کو۔ بر سات جاہی تھی اس وقت“

”اوہ فساو کب شروع ہو گئے تھے؟“ ”غنی نے سوال کیا۔
 عدالت علی بولے ”میاں فساد تو جوں، ہی میں شروع ہو گئے تھے۔“

میرا اعتبار اٹھ چلا۔ اس فقیر نے جب میری یہ کیفیت دیکھی تو ایک روز بھر سے مطلب میں
نچھ پر قہقہہ رکا یا اور بولا کر «اے حکیم، اے نادان معالج تو کس کا علاج کرتا ہے میں جنوں نہیں
ہوں، جنوں نجھے البتہ ہے» میں اس کے فقرے پر کچھ خفیت کچھ کبیدہ خاطر ہوا۔ تب وہ میر
روبرو ہو بیٹھا اور ایسی داستان عبرت فر انسانی کہ میں کیا مطلب میں بیٹھے ہوئے سب لوگ
سنائے میں آگئے۔

حکیم جی نے حتھ کے گھونٹ لئے، ہنکارے، بھر کھنے لگے «یار و ذرا کان دھر کے سنوار
درس عبرت حاصل کرو۔ یہ ایک گزر سے زمانے کا فنا نہ ہے اور مئے شہروں کی داستان ہے
کہ گلی کوچے ان کے کہانی اور لوگ وہاں کے فانی ہوئے پر سوچو تو یہ آج کی بھی داستان ہے
کتاب کے بھی ہمارے شہر اسی فتنہ فرنگ اور اسی چرخ کے یزندگ سے اسی طرح یہ چراغ
ہوئے اور جو لیاں اسی روشن خاک کے ڈھیر نہیں۔ اہل شہر کا اعتبار اسی طور لٹتا اور عزت ٹلار
لکھیں اسی طرح کچھ پیوند زہ میں ہوئے، کچھ در بذر خاک بسر ہوئے۔

ہاں تو دوستو وہ فقیر میرے رو برو چوکی پر دوز انو ہو بیٹھا اور سب کو غاظب
کر کے اپنی دل خراش داستان یوں شروع کی۔

جو جانتا ہے وہ جانتا ہے، ہو نہیں جانتا وہ جان لے کر میں سمند خاں ابن الجند خاں ابن
دعا وند خاں سالار اعظم نخت خاں کے شکر طوفان اختر کا ایک ادنی اپا ہی ہوں کہ ہر چند
کہ فرنگیوں نے اس شیر بیشہ شجاعت کے نام کو مٹانے اور کارناموں پر پردہ ڈالنے
کی کوشش کی ہے لیکن آفتاب پر کس نے پردہ ڈالا ہے۔ شجاعت کی اس کی دھوم
ازہنہ تاشام دروم ہے اور بریلی سے دلتک جس جس بستی سے اس کے شکر کا گزر
ہوا ہے۔ مرد اس کے نام کی تسم کھاتے ہیں۔ باڑوں کی راتوں میں چوپا لوں میں لا اُ
جلتے ہیں اور اس کی دلاوری کی داستانوں سے سینوں میں آگ دیکھتی ہے اور حون گرم ہوتا
ہے اور بولڈھی دادیاں، نانیاں بچوں کو اس کی بہادری کی کہانیاں سناتی ہیں اور کنواریاں

ڑکیاں بالیں اس کی واپسی کے گیت گاتی ہیں۔

دوستو، دلی نے ہمیں بہت خراب کیا۔ سبیل سے دل انک کی راہیں گواہ ہیں کہ ہم کیونکر بریٹیں سے طوفان بن کر لٹھتے اور اندھی و حامدی دلی چلتے تھے۔ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے جنگل کھنڈل گئے، پھاڑ مسل گئے۔ پھاڑوں، ریگز اروں کو روشن تا جنگلوں، باعوں، کھیتوں کو گھونڈتا شکر طوفان اندھلی پر امنڈا۔ پر دل کی راہیں زلف گرد گیرین گئیں۔ مغلوں نے میرے آقائے نامدار سے دغا کی۔ سعدِ حم صبح کو کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ آج رن پڑے گا اور روزِ شام کو کمریں کھول دیتے تھے۔ نیکت، اس ہفتہ نامبارک کی پیشانی پر رقم تھی بلجے آج بھی ایچی طرح یاد ہے کہ روز تڑا کے میں خبیث خیسے کے پتھے سے اس بخخت فقیر کی صدائی تھی۔

طوفا مینا دستڑی جی

کوڑی پیسہ د مرڑی جی

راجا پر جا د مرڑی جی

دلاور خاں تو اس آواز کو سن کر دیوارہ سا ہو جاتا تھا وہ کئی ہار تلوار سوت کر خیسے سے باہر نکل آیا کہ اس فقیر کا ستر فلم کر دے مگر وہ فہر کبھی نظر نہ آیا۔
مگر اس صبح کو عجیب بات ہوئی کہ اس فقیر کی آواز کان میں نہیں آئی۔ ہفتہ آج کچھ خاموش سا تھا، ہم ہتھیاروں سے سچ رہے تھے کہ اتنے میں سخت خاں کی آواز نہ ہمیں سب کو چونکا دیا۔

”دلاور خاں“،

دلاور خاں ہو دب آگے بڑھا۔ سخت خاں نے اسے اپنی انگوٹھی دکھائی۔ دلاور خاں سہم کر چک چو گیا۔

عربیز و باتیز و چاندا چاہیئے کہ سخت خاں ایک انگوٹھی پہنتا تھا کہ اس میں فروری سے کا ایک قیمتی نگ جڑا اپھوا تھا اور اس کی بدولت اس نے بہت سے معمر کے جیتے تھے۔

بخت خال کا معمول تھا کہ روز جب اٹھتا تو پہلے اس بگ کو دیکھتا پھر ہتھیار آراستہ کرتا آج
جب اس نے اٹھ کر انگو بھٹی پر نظر والی تو بگ پڑھا ہوا تھا۔

محتوڑی دیر میں خجے پر دنکا ہوتی۔ چوبدار ہر اس ان پر شیان حاضر ہوا عرض کی «حضرت
خربدآلی ہے کہ شہنشاہ قلعہ سے باہر نکل گئے»۔

دو سو مغلوں نے میرے آفائی نامدار سے دغاکی۔ وہ وقت بخی خوب یاد ہے گویا آج
کی بات ہے کہ بخت خال مقبرہ ہمایوں میں شہنشاہ کے حضور میں حاضر تھا اور ہم باہر صین باندھے
تلواریں نیام سے کھینچ کر رہے تھے کہ آج رن پڑے گا، دلوں کے ارمان لکھیں گے، حاکی خاک میں
لؤں گے۔ شکر مانند چولما چڑھے کر طحاو کے تاؤ کھاتا تھا اور ہر شکری مثل سیل گرم ابلد پڑتا
تھا۔ وقتاً بخت خال باہر نکلا، تاؤ کھاتا ہوا، غیض و غضب میں بھرا ہوا چھرو تھنا تھا،
منہ سے کف نکلتا تھا اور پرلوں کو یوں پڑھتا ہوا چل رہا تھا کہ ہم دہل گئے کہ اب دل کی زمین
بھٹی اور اب مقبرہ ہمایوں بیٹھا۔ مگر دل کو ابھی اور دن دیکھنے تھے اور مقبرہ ہمایوں کو کچھ
اور نظارہ کرنا تھا کہ بخت خال نے رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا پھر تم
سم خاطب ہوا اور فتاۓ نامدار اپنا ہیان و فاشہ اور ہم سے دغا ہوئی۔ شجاعت و جنت
یخور کے گھر سے رخصت ہو گئی بیزرت نے اس شہر سے منہ موڑ لیا اور پاس ناموسیں مست گیا۔ اب
بے شہر خراب ہوا۔ اس شہر سے نکل چلو کہ اس نے بھیں ناکامی کا منہ دکھایا کہ اس نے بخت خال
کو خدا رکایا، بخت خال کی فاتحانہ آن کو مجہہ کیا۔ شاہ جہانی فلمعا پنچ جگہ سے ہل گیا جہاں آباد
اے بے ضر بہو اچا ہتھا ہے، شاہ جہان کی زمین ہم پر بندگ ہو گئی مگر استد کی زمین بہت وسیع
ہے۔ آدمبند الون میں نکل چکیں اور پہاڑ اور علکی را۔ لیں کہ بھادر کھلے میر الون میں لرڑتے
ہیں اور پہاڑوں پر سورج بچے جلانے ہیں۔

عزیز دبای عزیز دماب غبطہ ہو تو یہ فساد بعترت فر اسنک در دلنوں وقت ملئے تھے
اور ہم دلی سے نکلتے تھے۔ آفتاب دن بھر کی سافت سے تھاک کرد جلد مغرب میں

عزم ہو رہا تھا اور جنما کے پانی پر سایہ پھیل چکا تھا۔ سایہ شاہ جہانی کی فضیلتوں اور برجیوں پر بھی پھیل چکا تھا۔ سایہ شہر کی فضیل پر بھی پھیل چکا تھا۔ شہر کی فضیل اور شاہ جہانی قلعہ کے برجوں سے دور قلب میثار کی بلندی پر بس ہلکی دھوپ ماند ایک سرکتے سائے کے باقی تھی اور کوئی دم میں معذوم ہوا پا ہتی تھی، عزیز و باعتیر و شہر کی فضیل پر سایہ پھیل چکا تھا۔ شہر کی فضیل صورت تصویر خاموش تھی برجیوں پر نصب توپیں کہ گل تک گرا ہیں مار رہی تھیں اور صفت احمد پر آگ اگلی رہی تھیں، خاموش تھیں۔ دور سے کسی ایلی توب کی آواز آرہی تھی۔ شاید لاہوری دروازے کی توب ابھی تک چلتی تھی۔

ہم حل سے نکلے تھے کہ رات نے ہمیں آیا اور راہیں تاریک ہو گئیں۔ عجب انہیں حیرا تھا کہ رستہ کیا معنی ہا تھک کوہ تھ سچائی نہ دیتا تھا۔ لگز سخت خانی شکر کا سلاپ سارے بند توڑے چکا تھا اور جو قدم اٹھ گئے تھے انہیں کوئی کرڑ نہیں سکتا تھا مشتعل برجیوں کو حکم ہوا کہ آگے آئیں اور مشالیں جلا دیں۔ تب مشالیں روشن ہو گئیں۔ انہیں حیرا جنگل اور دہشت دہشت کرتی مشالیں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے نکلتی ہوئی چیکاریاں اور اور پر قافلہ بجوم شب کے دریان جلا دیں۔ نکل کر مثل انگارے کے دکھنا تھا اور ساٹھ ساٹھ سفر کرتا تھا۔ یوں انہیں دہشت ڈالتا اور جنگلوں کے سینے کو تنقی کرتا بخت خانی شکر منزروں پر منزليں طے کرتا تھا اور رات کے پر میں میں کہیں سے کہیں پہنچا تھا۔ جانے کیا وقت تھا مگر رات بہت گزر ہیں تھیں۔ کہ سخت خان نے گھوڑے کی ہاگ روکی اور سوال کیا ”عزیز نہ ہم کس مقام پر ہیں“، ہم نے اپنے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچیں اور دم خود کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو تکنے لگئے۔ کہ ہم میں سے کسی کو پتہ نہ تھا کہ ہم کس مقام پر ہیں، سیدھی راہ چلتے ہیں یا راہ بھولے پیں۔ تب سخت خان نے فرمایا ”غاز یو جا بنازو، یوں بے سوچے سمجھے انہیں میں بڑھے جانا قریب مصلحت نہیں۔ جان بوججو کراپنے تھیں خطرے میں موانا کوئی حکمت نہیں چاہیے کہ منزل کرو اور دو گھنٹی آرام کر لو کہ سولیں اور سوچ لیں کہ ہم کہاں ہیں، کس طرف

جاتے ہیں اور کس طرف جانا ہے۔ پر وہ شب کو غیبت جانو کہ غینم کی نظر سے پوشیدہ ہیں صبح ہوگی تو قیامت آئے گی اور ہمارے ضفر کی خبر دشمنوں تک جلنے گی۔“

یہ حکم سن رہم گھوڑوں سے اتنے اور اس دشت پر خطر میں حضر کیا کہ اردو گردوارتک اپنے کامے درختوں کے سوا کچھ دکھائی نہ پڑتا تھا۔ ہم کیا بے مر و سامانی میں دلی سے چلے تھے۔ کہ سامان سفر و حضر بھی پورا ہمراہ نہیں تھا جب گھوڑے کو درخت کے تنہے سے باندھ، زین ہر کے بنچے رکھ رکھ زمین کے فرش پر آسمان کی چھٹ کے بنچے دراز ہوا تو سمند خاں نے کہ معرکہ کا رزارہ میں کیا ہی رہن پڑے کبھی ہر اس انہ ہوا اس وقت دیوقا میں مخلوقات بسہ پوش اشجار بے شمار کے زرعے میں اپنے تیس بہت حیرت جانا۔ اشجار بے شمار کے لکرے پرے دشت نکل میں انگنت مشعل برداروں کا بلوں جلا دنک کے ساتھ روان تھا۔ دفتاً ایک ستارہ لوٹا اور پہنائے نکل میں ایک روشن نکیروں دوڑتی چلی گئی کہ میدانِ جنگ میں کوئی گراں ٹولی سپاہی گرا ہے۔ اور اس کی خبر صرف بصف کران تاکران پھیلتی ہے۔ ہم نے کامے جنگل میں پڑا اور کیا تھا اور عرصہ نکل پر فوج بخوم کا کوچ جاری تھا۔ معلم مجھے خیال آیا کہ فوج بخوم بس گز را پا ہتی ہے۔ اور آسمان کا میدان خالی ہوا پا ہتا ہے۔ جانے کیوں اس خیال سے میرا دل و حضر دھر لکرنے لگا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوتی تھیں کہ نیند کے لشکر نے یلغار کی اور دیوقا میں اشجار بے شمار اور آسمان کے ان گنت مشعل بردار سب اس کی گرد میں گھر ہوتے پڑے گئے۔

ستانہ سحری کی غود کے ساتھ ارادہ کوچ کا درود ہوا جب ہیری آنکھ کھلی تو نخت نما آرستہ ہو چکا تھا۔ مگر اس کے چہرے سے نشویں عیاں تھی۔ دل اور خاں نے بڑھ کر عرض کی کہ آقا نے ناما را کچھ حضور کو نشویں کیسی ہے۔ جواب یہاں دل اور خاں رات ہم نے عجب خواب دیکھا کہ اس وقت سے نیند خواب ہوئی اور رات سائکھوں میں کٹی۔“ اس پر ہم سب کو نکر فرزوں ہوئی اور سوal گیا کہ“ اے خداوند نعمت وہ خواب کیا تھا جس نے ہمارے آقا کو بے حرام کیا۔

اور ہمارے لئے نکر کا سامان کیا۔^۴

تب سخت خان یوں گویا ہوا اسے یارانِ باوفا اور عزیزانِ باوفا کی فیض اس خواب کی یہ ہے کہ دیکھا کر ایک لمحہ سے اور سخت خان اکیلا ہے۔ شکری چھڑپچکے، میں پاہی چھٹ پچکے ہیں۔ چھڑ دیکھا ایک بینار ہے کہ انگاروں کا ایکہ بنا ہے کہ کسی اس کی جکی کے پاٹ کی صورت بنی ہے اور گرم رفتاری سے گھومتی۔ چہ کہ بینار پر لگاہ نہیں بلکہ، میں ایک شعلہ سینہ و گلیتی سے تاچڑخ چنبری بلند ہوتا اگر دش کرتا نظر آتی ہے۔ میں ڈر اکہ یا معبود یہ کیا سمجھتا کار نا نہ ہے مگر فوراً ہی خیال آیا کہ یوں ڈرنا خلاف شیوهِ مردانہ ہے۔ لغڑہ جیدی یا عالی بلند کیا اور گھوڑے کو ایرڑے کر دم کے دم بیس میلار کے پاس پہنچا۔ عجب ہوا کہ جب کا باٹ گھستنے گھومتے رک گیا اب جو دیکھا تو اور ہی منظر کھلا کر دیجع و عربین، قدر کی ایک چکی ہے، جو کہ برا ایک بندو بالا مینار سر تا سر نگ مرعن کا ہے، بینار پر ایک بڑو ج ہے، بڑو ج میں ایک بڑا اسانسوارہ رکھا ہے، نقار سے کہ برابر ایک چوبی دھرمی ہے اسے یارانِ باوفا اور اے عزیزان!

احمد! اس وقت مجھے طرفہ خیال آیا کہ مینار پر چڑھا دا درا اس نقار سے کوئی سماں کر قدرت خدا کا تراشنا دیکھو۔ اس بلندی سے نثار سے کی آواز ناصلوں پر غالبہ اور ملک پر محیط ہو گی جس بستی، جس جگل، میں سخت خال کا سپاہی آوارہ۔ بجے خانماں پھر تا۔ ہے وہ اس آواز کی شنے گا اور ڈرخ اس سست کا کمرے گا۔ میرے دل میں الجھی یہ خیال آیا، ہی تھا کہ مینار کے اندر سے صداؤں میں اے بند سخت اپنی کڑی مل جوانی پر حجم کر اس مینار سر امنار سے خدر کر، یہ نندگی اور موت کا بولماک کھلی ہے۔ اس کھلی میں تھوڑی باتیں بان ہے، جی کا زیاد ہے، اس صداؤں میں سنتے لالکار بنا اور ڈرچھے میں اپنی وسیع سپاہی مذکورے خلاف سمجھا، مسوچا ہر چہ باد آیدیں، میر فرزندِ آدم اور مانند مینار میں، خل ہو گیا، وہ مینار باہر سے مثل انگارہ روشن یکسن بندو سے نیرہ دنار تھا، مگر مانند کرنا ار تھا، از بینہ، سجدار تھا، پچ میں یچ پر پڑا کہ مینار کے اندر قدم رکھتے ہیں جکی چھر گھومنے لگی اور مینارہ ہرچ کھلنے لگا۔ اے عزیزان! اس وقت بھر پر

بنی ناطقی محلی اور محب وقت خادی ہوئی کہ بخت خاں تو اپنے تین بہت بہا در جاننا تھا اور شجاعان بے مثال اور عریفان رسم و زال سے بزد آزاد ہوتا تھا زمانے کی گردش نے کیا دن بھی ہے کہ وقت کی چکی میں بے وجہ پے ہاتے ہیں اور پیاری ہو گرے لڑے اسے اسے جلتے ہیں ناگہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ٹاپوں کی آواز سے سارا دشت گونج گیا۔ ایک سوار سبز پوش قبضے میں شمشیر آبدار چہرے پر نیاب داخل ہوا کہ اس کے اندر قدم رکھتے ہی مینار گھومتا گھومتا ختم گیا اور زینے کا راستہ اجل گیا اور ہماری سلکھ کھل گئی۔

پھر بخت خاں نے مکوت اختیار کر لیا اور پیاروں کو وسوسوں اور وہموں نے مجھر لیا۔ اس وقت مجھے معا اپنے جدا مجدد کی بات یاد آئی اور موذب عرض کیا کہ «آقا نے نامدار گستاخی معاف ہوا یہ خواب نہیں تھا، بشارت تھی۔»

. بخت خاں نے نہایت وقار سے سر بلند کیا اور مجھ پر نظر فرمائی «وہ کیونکر؟»

حکایت شیرشاہی مینار کی

یہ موذب ہو بیٹھا اور یوں عرض کیا کہ «اے آقا ہے ولی نعمت میں سمند خاں ابن ارجمند خاں ابن دماؤند خاں خانوادہ اس خاندان عالی شان و بلند نشان کا ہوں جس کا اسلہ نسب شیرشاہ سوری سے ملتا ہے۔ میں نے اپنے جدا مجدد سے اور میرے جدا مجدد نے اپنے جدا مجدد کے یوں سنایا کہ ہمارے جدا عالی حضرت شیرشاہ سوری نے کرہ ارض کے قلب میں ایک کیل بھورت مینار بلند پورست کی تھی۔ یہ زمین پران کی آخری فتح تھی۔ اے آقا ہے ولی نعمت اور اسے یاران طریقت، کرہ ارض فارس کی حضرت شیرشاہ سوری کے میں گیندا کو لا نخاک جس طرح چاہتے تھے اچھاتے تھے اور پکتے تھے۔ ارض پہند کی انہوں نے ابھی تباہی میں اکھیپنیں اپنے پرکوں کی زنجیریں کس طرح پہنائیں کہ آج تک کلکتہ سے پشاور تک کا فاصلہ ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، جانا جاتا ہے کہ ایک بار شیرشاہی شکر قلب گیتی کی راہ سے

گز را تھا۔ سمندروں کی گرد میں فاصلے گرد ہو رہے تھے اور مانپوں کی دھمک گاڑا رعنی تک پہنچ رہی تھی۔ ناگاہ ایک دشت پر ہرول نظر آیا کہ ریت مثل بالو کے جلی بیٹی تھی اور سطح زمین کی صوت دھڑکتی تھی۔ بھوڑوں کے قدم رک تھے۔ سوارِ تھنک گئے جسرا شیرشا منے لائے گھوٹے کو ایڑدی مگروہ رہوا لوحوز عین وزمان کی گردشوں کو اپنی مانپوں کی گرد جانتا تھا۔ اس سے مس رہوا اور رائے با تدبیرتے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا کہ «جہاں پناہ اس پر خطرہ راہ سے گزریے اور دوسرا راہ سے چلئے۔» حضرت شیرشاہ کو جلال آگیا فرمایا کہ «زمین سے ہر بیت اٹھانا مرد ان غلک و قارکے شاہان نہیں اور راہ کی دشواری سے ارض شکاروں کا ڈر جانا نظریت ارض شکاری نہیں۔ ہمارے سمندر سمندر اثر کا یوں ٹھٹھکنا، ہماری تو قع کے خلاف اور اس کی روشن سے دور ہے۔ مفتر اس میں کوئی راز مستور ہے۔ روایت کشود کشانی کا تھا ضاہیہ کہ اس گرہ کو کھولا جائے اور اس زمین کی حقیقت کو سمجھا جاتے۔

پس شیرشاہی شکر نے اس دشت دشت اثر میں پڑا اور کیا اور دن رات تدبیر اس زمین سے بھیڑ کو کھونے کی ہوئی رہی۔ دو دن تک شکر تک ودود کرتے رہے۔ مگر صرخ اس از دن طبا۔ نیس سے دن غلک جناب نے بنفس لفیس اس گرہ کو کشید کرنے کی بخشانی۔ پسوار ارض شکار پر سوار ہوئے اور عزم بالجہنم کیا کہ جو ہو سو ہو آج ہم اس دشت کو صڑو رجبور کریں گے۔ زندگی کو ایڑھ دیا چاہئے تھے کہ ایک مرد بزرگ نامعلوم تھت سے ہو دار ہوا اور آگے بڑھ کر کام تھام لی اور بولا۔ ملے شیرشاہ اس ارامے سے بازاں اپنی رعیت پر رحم کھا۔ اس دشت بلا میں جس بادشاہ نے قدم رکھا۔ ہستہ کو اس کی زوال ہوا، رعایا کا ابتر حال ہوا، برباد تک مال ہوا۔

دریافت فرمایا۔ اس بلا کا کیا باعث ہے؟

اس سر دروانکے جواب دیا۔ اے کشود کشانی گستاخی تھا! یہ مقام زمین کا قلب ہے گاڈریں کے دونوں سینگوں کے عین درمیان واقع ہے۔ قلب گفتی مقام کر بے بلاء ہے کہ مردان خطر پسند

کو لکارتا اور تجھاڑتا ہے جو دلاور قطب گیتی کو مخفی میں لے گا اور قابو پائے گا۔ چار دن بھی میں ڈن کا اس کا بجے گا اور بمال سے نے کر دندھیا جل اور دندھیا پل سے راس سکاریت مکمل طبقت اس کی بھیلے گی۔

تب میرے جدا جمد کو جلال آیا کہ جب کشور کشانی کے پڑھتھ میدان میں قدم رکھا ہے تو جھکنا کیوں اور مادھی راہ چل کر پٹنا کس واسطے بڑھ کر نام بو تراپ کالیا اور نیزہ پھینک کر ایسا اماڑا کیہ چوں یعنی اس دشت کے کڑا گیا اس کا عجوب ہوا کہ دشت ہلتے ہلتے رک گیا۔ تب جدا جمد نے حکم دیا کہ اس فتح کو پائیے کمال تک پہنچائے اور ایک مینار بلند تعمیر کر جئے کہ برج میں اس کے نقارہ رکھا جائے۔ نقارے پر چوب پڑے اور شیر شاہ کی فتح کا عالم میں شور پڑے۔

تب دو دوسرے ہو گئیں اس کی مسازیں اور سات اس کے زینے تھے۔ ساتویں مسازیں میں ایک برج تھا اس میں نقارہ اور چوب رکھی گئی کہ نیک ساعت شیخ گھڑای دیکھ کر شیر شاہ کے نام کا انعام رکھے۔ دھرمیہ انتظام تھا اور ہر کچھ اور ہوا چاہتا تھا ناگہاں جانب مغرب سے عبار اٹھا اور ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی جب فدا گردی ہی تھی تو دیکھا کہ راجھوں کی فوج مورچ موج پلی آئی ہے اور اوفان بلابن بکر ٹوٹا چاہتی ہے۔ شیر شاہ ہی شکر دم کے دم میں آرائیہ ہواں طوفان بلاد کے قیامت کر دیکھا یا اور دشمن کو دودھ کب بھکایا مگر ستم ہوا کہ دشمن کا انعقاب کرتے کرتے شکر اتنی رور نکل گیا کہ مینار فلک کا نظر دن سے او جھل ہو گیا۔ تب دشمن سن چلا، صدیں درست کیں اور ماکاروں پر ڈا۔ مگر مینار نظر دن سے او جھل ہو چکا تھا اور شیر شاہ کی زندگی کا آنکھ عزوں ہوا پاہتا تھا۔

میں نے اپنے جدا جمد سے اور میرے جدا جمد نے اپنے جدا جمد سے یوں نہ ہے کہ ہمارے جدا علیٰ حضرت شیر شاہ نے مرتے دم آل و انصار کو وصیت فرمائی تھی کہ جب شیر شاہی مینار کے نقارے کی آواز کان میں پڑے جاننا کہ شیر شاہ کی نوحہ کو مسازیں تک پہنچانے والا پیڑا ہوا اور

اس کی نعمت سپینا اے ہما مئے دلی نعمت اور اے یاراں مل بیعت دیکھنا خواب میں اس
مینا ر کا ظاہر کرتا ہے کہ نقارہ شیرشا ہی پرچوب پڑنے کا وقت آپ سخا،»

بخت خان نے تعبیر اپنی روایاتی میں لی تو یوں گویا ہوا کہ «اے رفیق، وہ مینا کس سمت
میں ہے اور کتنے دنوں کی راہ ہے۔»

میں نے منصب عرض کیا کہ «آقا مئے دلی نعمت، میں نے اپنے جدا ہجده سے اور میرے
 جدا ہجده نے اپنے جدا ہجده سے بیوں سنائے کہ شمال مغرب میں برس دن کی راہ ایک گھنی بنی ہے
گھنی بنی سے پرے کالی ندی ہے، کالی ندی کے اس پاروہ دشت پر فارہ ہے، اس میں وہ مینا
فلک آتا ہے۔»

اس عاجز کا یہ کلام سن کر بخت خان یوں گویا ہوا کہ اے رفتائے ناہدار اور اے غازیاں
وفاق شمار، شیرشاہ نے زمین کی طباہیں خوب کھیچیں اور بے فرنگ فاصلوں کو خوب بکردا
مگر وقت کے دریا پر بندہ باندھا۔ وقت بغیر کرہ ارض میٹی کا ڈھیلا ہے۔ وقت نے شیرشاہ سے
دعا کی اور زمین کو اس کے پنگل سے چھڑا بیا کہ قلب گئی چھر ماند ٹیکھے کے دھڑکتا ہے
اور شیرشاہی مینا رسان آیا تے در گردش کرتا ہے جرنیلی سڑک فوج فرنگ کے قدموں
تلے کر اہستی رہے۔ چوڑپر اس کی ڈھیلوں کی بنائی ہوئی دھواں گاڑی دوڑتی ہے۔ شیرشاہ میں
سرابیں ویران ہو گئیں پیاوے سوکھ گئے، مٹھے مٹھے کنوئیں کچھ کھاری ہوئے کچھ خاک سے
آٹے کچھ لاشوں سے پیٹے اور مٹھے پیڑوں سے جھاؤں رخت ہو گئی جرنیلی سڑک کے پیڑ
چھاؤں سے خردم، مسافر لوازی سے محبوہ، بر قی تاروں میں جکڑے ہوئے سر بر پہنہ شہزادیوں
کو نازک اندا مول کو گل بدنوں کو حیراں جیرا پھرتے درج سفر اٹھاتے، ہرج مرچ کھینچتے۔
ششند رکھڑے دیکھتے ہیں اور اپنے لگانے والے کے اقبال کا نوحہ کرتے ہیں۔ رفیقو، وقت
کی زال بیسوں نے شیرشاہ سے دعا کی شیرشاہی سڑک کے یہ قطار قطار قیدی شیرشاہ
کے جانشیوں کو پکارتے ہیں۔ غازیو اس بکار کو سنو، ان بر قی تاروں کو کامٹو اور اشیا

سایہ عاد کو ان کا سایہ اور ہر یا لی اور شادابی والیں دو۔ آج عرصہ حیات عرصہ جنگ ہے مقام نام و نگہ ہے، وقت سے لڑائی ہے، مذہب نے میں رسوائی ہے، وقت کے دھار سکو موڑو، شیر شاہ بھی مینار کی گردش کو روک کر لغارے پر چوب پڑے اور چار دا گل میں شیر شاہ کا ڈنکا بجھے گھوڑوں کی باگیں اٹھاؤ اور برس دن کی راہ چینے میں طے کرو کہ زمین وزماں کے معاف یہی پہلا مور جھتے اور ارض شکاروں اور فاستخانے دہر کا یہی اولین مرکز ہے۔

تب بخت خاں بعد جاہ وجہال سمندر اڑھا قدم پر سوار ہوا۔ میں نے یوں جانا کہ ایک بھاری تو دافضایں بلند ہوا استکری صفت بصفت گھوڑوں پر سوار ہوئے، عازم مینار ہوئے جنگل کھنڈل گئے، صحراء میں کم از کم زلزلہ الحا کا منظر سیدا ہوا، دھرتی کا بلجھ شق ہوا، عزیز و عجب سفر تھا کہ گھوڑوں کی پیٹھ ہمارے جسم کا جزو بنی تھی۔ سلسہ روز و شب درہم ہوا تھا، صبح و شام کافر اٹھا گیا تھا۔ ساعتوں اور پھر اس کی تقسیم مت گئی تھی۔ وقت کے بھتے دھارے میں کیا روز و شب کے بلیے اور کیا ساعتوں اور پھر اس کے مصنوعی ڈوبنگے شب بگئے تھے۔ وقت کا سلسہ بہتا دھارا تھا اور، تم تھے، ہمارے سمندر اڑھا گھوڑے تھے۔

پڑتے چلتے ایک گھنی بی میں گزر ہوا اس میں قدم رکھتے ہی اندر چراہوا عجب الخلق تدوش و طیور عودا رہتے اور ایسی میب آوازیں آفی شروع ہوئیں کہ بھاڑوں کا زہرہ آب ہو پڑر دوں کا بلجھ چھٹ جائے۔ اس وقت بخت خاں کی صدائی میب لشکر میں گو سنجی کہ "غماز یو، آج عرصہ حیات عرصہ جنگ ہے، مقام نام و نگہ ہے، وقت سے لڑائی ہے، مذہب نے میں رسوائی ہے" اس صدائی سے پہاڑوں نے حوصلہ پکڑا اور ایک مرتبہ پھر گھوڑے یوں دوڑے کہ وہ جیب شوران کی ٹاپوں کی آوازوں کی گرد دن کر رہ گیا۔

نذر کرہ کالی ندی کا

خدا خدا کر کے اس گھنی بی میں نکلے۔ مگر یہاں اندر چرا سوا تھا۔ کالی ندی ہی تھی اور

لہوں بیوں انھی تھیں جیسے رات کے اندر ہیرے میں ٹلواریں ملپتی ہیں اور خنجر جھکتے ہیں اور اس کی گرجتی دھار..... عزیز و پانی کی دھار عجیب گرجتی ہے۔ جاننا چاہیے کہ اس برس پانی زور بر سا تھا۔ ہند کے سارے دریا امنڈ سے ہوتے تھے جب ہم غازی آباد سے آگے نکلے تھے تو دلت کو دور سے بار بار ایک آواز آتی تھی۔

ندی نربراکا جل گرجے گھوگھا کی دھار

بنخت خاں نے پوچھا، "رفیقو یہ آواز کیسی ہے کہ دل اسے سن کر حظر کرتے ہے اور لوگوں کی گردش آپ ہی آپ تیز ہو جاتی ہے بیکوئی نہ اسے عجیب ہے یا کسی حادثے کی خبر ہے؟" اس پر ایک سیرخڑک کا غازی بیوں گویا ہوا اسے آقا، یہ نہ تو نہ اسے عجیب ہے بلکہ کسی حادثے کی خبر ہے ہماری کسی بستی میں آلا اداول پڑھی جاتی ہے۔ برسات اب کے بہت لمبی کھنچی ہے کہ جنم اتنی بھی ہوئی پر عینہ کی جھٹڑی اسی طرح لگی ہے اور آلا اداول کی سمجھا بستی بستی جھی ہے۔" عزیز دبر سات اس بار پرچم بہت لمبی کھنچی ملتی۔ پانی زور بر سا تھا۔ تال تیساں ابھی تک ببابک کٹواروں کی طرح چلکی سمجھیں اور ندیاں چشم پر اب کی طرح بہتی تھیں۔ جتنا کی لہوں کو ہم فضیل سے سر پھلانا چھوڑ آئے تھے۔ گنگا کی دھار ہر دوار سے لکھتے تک گرجتی تھی۔ گومتی کا پانی ماندر فرات کے ابتداء اور زبدانی تانیبا توپی کی فوج کی طرح کبھی پھیلتے پھیلتے پچھاں کو سچوڑا پاٹ بناتی تھتی کبھی سکڑ کر پھاڑوں کے اندر ہیرے میں گم ہو جاتی تھتی مگر کلان ندی سبندیوں سے زالی تھتی کہ اس کے اور چھوڑ کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا اور اس کی تھاں کی کوئی تھاہ نہ لگتی تھتی۔ ہم سب دم بخود تھے۔ کالی ندی کی دھار گرج رہی تھی۔ گانگا گمان ہوا کہ کوئی شکر بیغار کرتا ہے، گاہ خیال گزرا کہ پھاڑوں سے کوئی آندھی اٹھتی ہے عزیز و پانی کی آواز عجیب ہوتی ہے جن غازیوں اور سوریاوں کے سیداب پر توپ و تفنگ سے آرائستہ فرنگی بندہ باندھ سکتے تھے انہیں پانی کی آواز نے دم بخود کر دیا تھا۔ دفعتاً ایک گھوڑا دہشت جھری آواز میں ہنسنا یا اور صفت سے ٹوٹ کر معہ سوار سر پت

جاتا اور درختوں میں مرڑا گیا۔

سب ابھی ششندہ تھے کہ یہ کیا ہوا اور کیون کہ ہوا کہ اتنے میں میں نے اپنے براڈ لاؤ خال کو دیکھا کہ گھوڑے کی بیٹھ پر مثل سید کے کاپتا ہے اور پھٹی چھٹی آنکھوں سے ندی کی طرف تکتا ہے میں نے آنکھ چیلکی تھی کہ دل اور خانے دہشت میں نعرہ مارا اور گھوڑے سے کو دکر آن کی آن میں ندی میں چلانگ گیا۔

دل اور خان کا ندی میں چلانگنا قیامت ہوا۔ ندی کی دعا رزود گرجی جانو بادل گرجتے ہیں۔ عزیز و بادل زمین میں بھی گرجتے ہیں اور بھلی پانی کی تہ میں بھی کڑکتی ہے۔ اس سماں ندی میں بادل بھی گرجتے اوز بھلی بھی کڑکی کہ جانو زمین کی تہ چھٹ گئی اور اندر دبا ہوا لاوا پھوٹ پڑا۔ ایک آندھی چلی کہ زمین و زمان تیرہ و تار ہوئے اور پھر خون کی بارش ہونے لگی۔ کالی ندی پہ خون برسا اور آسمان صرخ بوٹی کی مثل ہو گیا اور جنگل لال آنکاروں کی طرح دہکنے لگا۔ گھوڑے ہنہنائے، صفیں تتر بتر ہو گئیں، سپاہیوں کے ہاتھوں سے باگیں پھوٹ گئیں اور جس گھوڑے کا جدھر منہ اٹھ گیا دہشت میں ہنہنا تاگاہ معہ سوار کے گاہ سوار کو پڑھ سر پٹ دوڑتا چلا گیا۔

اس رستاخیز میں میرا گھوڑا بھی بگڑا اور قداوٹی آوانی میں ہنہنا تا بکٹھت بھاگ چھٹا۔ راست کے آندھیرے میں کچھ بیزندہ چلا کر کھاں جاتا ہوں۔ باگ پہ ہاتھ تھانہ پاؤں رکاب میں تھے جب تڑ کا ہوا تو اپنے تیکیں اکیلا ایک سنسان جگہ میں پایا۔ نہ وہ کالی ندی تھی نہ گنی بنی تھی۔ نہ لشکری نہ میر شکر۔ آدمی کا دور دور پتہ نہ تھا، جنگل بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور گھوڑے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ جس راہ چلتا ہے چلا چلے۔

داستان شہر ویران کی

چلتے چلتے راہ میں ایک بستی نظر آئی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور بستی میں داخل ہوا گئے

وہ بسی عجیب تھی، خالی ڈھنڈار پڑھی تھی، نہ مساکین نہ دکا کیں۔ گلی کوچے ہو جئی کرتے تھے، ہر مکان ویران، ہر مکان بے گولیوں کے نشان، حوصلیاں ڈھنی ہوئیں۔ دکا کیں گری ہوئیں، فارگری کے نشان مکان مکان، خوزیری کے آثار گلی گلی، جو کوں اور بازاروں میں جا بجا لائیں پڑی تھیں دکانوں کے دروازے کھلے تھے، مال بکھرا ہوا پڑا تھا۔ مکانوں کے دروازے شکستے تھے، پھر پار غائب تھے۔ میں تصویر حیرت بنا کچھ ہر اس ان کچھ پریشان اس شہر مرگ میں جلا جاتا تھا کہ سامنے ایک عالی شان حوصلی نظر آئی۔ تو پوں کے گولوں کے نشان جا بجا تھے۔ بہت سے گلکرے گر کرے تھے اور درپیچے اڑ گئے تھے کہ یوں اس کی بلند دیواروں میں بھبھاتے کھل گئے تھے پچاہک چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ ڈیورڈھنی خالی تھی۔ لب ایک ہاتھی زنجیر تڑائے آواز آوارہ احاطے میں بھر رہا تھا اور فوارے کے ارد گرد کا، ہی بھی بانی کو سوندھ سے گخوں رہا تھا۔ اس عبرت فرا منظر کو دیکھ کر میرے دل میں عجیب خیال پیدا کر اندر چل کر دیکھو شاید اس افسانے کے آغاز اور انجام کا کچھ سزا غسلے۔

میں نے اندر قدم رکھا تو جانوروں میں ایک شور پڑا دیکھا۔ بظنوں کے جالی دار ڈرلوں میں ایک مقامت پڑی تھی اور ٹاپوں کے اندر مرغیاں چلاتی تھیں۔ ایک بڑی سی صندلی بلی ایک کمرے کے اندر نے سکلی اور مجھے حسرت بھری طلب آئیں گا ہوں سے دیکھے میاں میا وں کرنے لگی۔ میں نے ڈربے کھوئے اور ٹاپے اٹھائے تو بظنیں اور مرغیاں شور بھاتی ہے تاہذ فوارے کے ارد گرد بھرے ہوئے کاہی بھرے پانی کی طرف پیکیں اور ایک دم سے ان گنت چوپھیں اور پنجے کا، ہی بھرے بھرے ہوئے پانی میں پیوست ہو گئے۔

بھرپیں نے اندر قدم رکھا۔ یلوان ایک نظر آیا وسیع و عریض، مستف بلند صفت دائرے کی صورت، اوپنے اوپنے ستون، بڑی بڑی دیواریں کہاں سب پنجی کھٹی تھیں۔ قدادم آئیئے شکستے تھے، جھاڑ فالوس چکنا چور ہوئے تھے، شمعدان، گلدان، اگرداں، گلاب پاش، خوبصورت کشتیاں نازک صراحیاں، جھمکتے کٹوڑے اُجلے پیالے، سمنری روپیلی جھاروں والے

بخاری پر دے، زنگ زنگ لاثانی تصویریں۔ عرض صنعت انسانی کا ایک کارخانہ تھا کہ بکھرا پڑا تھا اور اپنی بے قیمتی و ناقدرتی کا فخر کرتا تھا۔

اس الیوال دسیع سے نکلا تو ایک صحمن کشادہ میں آیا۔ وہ کشادہ صحمن خالی پڑا تھا اور فوارہ بند تھا، سنگ مرمر کا حوض سوکھا پڑا تھا۔ ناگاہ ایک طوطے کے پھر پھر لئے اور چلانے کی آواز کاں میں آئی۔ نظر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے ایک لمبا چڑا دالا ہے، دالا میں ایک کندہ پڑا ہے۔ کندہ میں ایک نفیس پنجوں لٹکا ہے۔ پھرے میں ایک طوطا، لاچ پھما پھوچ گلے میں کنھی بazio پر سرخ پیس، پھر پھر لاتا ہے اور چونچ کھولے ہانپتا ہے۔ میں نے بڑھ کر پھرے اتارا۔ بہت ڈھونڈنے پر ایک روٹے گھرے میں چھوڑا سا پانی نظر آیا۔ تب طوطا چلا یا۔

«حَتَّى اللَّهُ يَأْكُلُ ذَاتَ اللَّهِ بَيْ بَلِ الْكُنُوْمِ مِنْ» «تب چھپریہ وہ راز ہو یہ اہوا۔ اس دالا کے عقب میں انداھا کنوں تھا۔ وہاں سے یہ آواز آتی تھی۔ میں نے اپنا صافا کھولا اور کنومیں میں لٹکایا۔ کسی نے اندر ہیرے میں وہ صافا پکڑا اور میں نے آہستہ آہستہ اسے کھینچنا شروع کیا۔ جب وہ شے کنارے پر آئی تو عجب منظر نظر آیا۔ گویا اندر ہیرے سے روشنی کی کونسل چھوٹی ہے یا پسپتی کی ظلمت سے متوجہ مخودار ہوا ہے۔ بدن روشنی رخاروں میں دیے جلتے ہوئے لوں کو دیتی ہوئی۔ مگر روشنی عبار میں تھی، ملبوس یہ رہر، مٹی میں اٹا ہوا، بال بجھے ہوتے ہوئے، ہونٹوں پر پڑا یا، لب بند، غشی کی کیفیت رہیں نے جلدی سے اس نور کے پتھے کو گود میں اٹھایا اور چھپر کھٹ پڑا۔ بخش دیکھی۔ رخارا اور پیٹھانی کو چھوکر دیکھا، منہ پر پانی چھڑکا، ہونٹ کھول کر ایک جلوپانی ڈالا۔ منہ پہ پانی پر ڈالا تو اس نے جھر جھری لی، آنکھیں کھولیں اور اُنھوں کر بیٹھ گئی۔ میرا دم میں دم آیا۔

وہ گلشنِ خوبی غمروالم کی تصویر بنی دیر چب بمحض رہی۔ میری طرف توجہ نہ کی اور میری جرأت بھی نہ ہوتی کہ اس سے بات کروں پھر اس نے یہ پیر لباس کو دیکھا اور چھپر کھٹ سکھنے کی طرف ہوئی۔

حمام سے جب نہاد صوکپرے بدل بال جنکتی نخلی میں سمجھا برسات آگئی، ساون کی گھٹا چھاگئی۔ وہ بدن کیا تھا ایک بغیر تھا، گات ہری بھری، مگر بھری بھری اسینہ کنوں کے دو پھول پھولوں میں دو گلیاں، یا یہی لچکتی ڈالیاں، رخسار شاداب، ہمونٹوں میں پھول کھلے ہوئے، انکھوں میں جو ہی بھولی ہوئی۔ میرے پورے کوں میں اور انگلیوں میں ہمچلیوں میں پورے بدن میں پھول کھل ائٹھے اور اس تصویر سے کہ میں نے ابھی ابھی اس جسم کو جھوڑا ہے۔ دماغ عرش میں جھولنے لگا۔ وہ بعد تملکت آئی اور چھپر کھٹ پہ بیٹھ گئی۔

میں نے آخر بہت کر مزاج پرسی کی۔ بولی "اچھے ہوں۔ بدن قدرے دکھتا ہے، بھی چنکتا ہے، اور آہ سو بھر جب ہو گئی۔

پھر بولی "مے عزیز جوان مجھے جواہان کرتا تھا کر لیا۔ اب اپنی کڑیل جوانی پر حکمر اور جلد اس خوست بستی سے نسل جا۔ جانے کس گھر طی کس آن فرنگی فوج اس سمت سے پھر گزرے اور باقی رہی سمی جانوں کو ملیا میٹ کر دے۔"

میں آبدیدہ ہو بولا "میں اپنے رفیقوں سے بچھر کر حذاب پھرتا ہوں۔ اپنی زندگی سے بہت نیک آیا ہوں۔ اپنے شکر کی جستجو میں آوارہ بھرتا تھا کہ قدرت ادھر لے آئی میں نے اس محبت یک نفس کو خلیت جاتا تھیں یہ محبت ایسی ہی ناگوار ہے تو پاہی پھٹے ہی خوار اور جی جان سے بیزار....."

اس بات پر وہ خوش بخت بھر ائی اور بات کاٹ کر بولی "اے ہے اچھے ساہی ہو۔ فدا سی بات پر شوے بکھارنے بیٹھ گئے۔ بجھ کاں کھاتی نے تو تمہارے بھلے کو کہا تھا۔ اپنی جان کے ایسے ہی بیری ہوئے ہوا اور جان بوجھ کر ٹھلاکت ہوں لیتے ہو تو شوق سے رہوڑا۔ ابھی وہ یہ کہتی تھی کہ باہر اعلیے میں میرا گھوڑا زور سے ہہننا یا۔ میں چون کاک کوئی آفت آئی۔ جلدی سے اس گلشن خوبی کی کلامی پکڑی اور کھینچتا ہوا چلا کہ دو شمن آگیا۔ یاں سے چل نکلو، ہمیں یوں جلتے دیکھ کر طو طا چلانے لگا اس کی آوازن کروہ مرطی اور بولی

اپنے مٹھو کو چھوڑ کر کسی حال نہ بجاوں گی۔ میں نے لپک کر بخرا بھایا اور اسے اسی طرح بھینچتا ہوا باہر لایا۔ بعجلت گھوڑے پر بٹھا، تجھے اسے بھایا، فرتاک میں بخیرے کو باندھا اور گھوڑے کو ایرڈ دی۔ رہوار سیک رفتار سرپٹ دوڑا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

اب رات ہوئی تھی۔ چاندنی چھار طرف پھیلی تھی، ٹھنڈک بدن میں اترنی تھی۔ میری رانیں رہوار سیک رفتار کی زین پوش پشت سے چپاں ہوئی تھیں، میری پشت میں وہ ہر بھرا سینہ پیوست ہوا تھا اور باہیں کمر میں تھیں اور میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کمر رہا تھا میں عرش میں جھوول رہا تھا۔ وہ رات میری شہسواری کا حاصل تھی۔ گھوڑے کی پشت پشت بنی تھی اور ہم چاندنی میں نہائے ہوئے اوس اولاد خشکی میں بھیگے ہوئے، باہم چکے ہوئے اڑ سے چلے جاتے تھے تھے یوں لگا کہ میرا گھوڑا از میں کے سارے رستے طے کر کے کرہ ارض کو چلانگ لگایا ہے۔

قصہِ مرتبان اور گاؤں سوار کا

رات گئے، ہم ایک بستی میں وارد ہوئے پوچھتے کچھتے ایک مرائے پہنچے کو ٹھہرای کرائے پہ لی جس میں ایک چار پانی اور ایک میلا سال بستر پڑا تھا۔ اس پر آشوب وقت میں ہم نے اس کو نئے کو بھی غنیمت جانا۔ بستر بچایا بھیریں نے تلوار نیام سے نکال درمیان رکھی اور دلوں ایک دوسرے کی طرف پشت کر پڑا ہے۔

مگر میری آنکھوں میں نیند کھا۔ کچھ بیتے لمھوں کی مرشاری کچھ قرب نما دوری کی بیقراری، بس ساری رات کروٹیں بدلتے کیٹی۔ یوں کروٹیں بدلتا تھا کرنا گاہ منحوس آواز ک شتر نہ بارک میں تڑکے سنائی دیا کرتی تھی کان میں پڑی۔

ٹوٹا مینا دمڑی جی

کوڑی پیسے دمڑی جی

راجا پر جا دمڑی جی

میں دہل گیا۔ یہ پریشانی ہوئی کہ پھر لاطک کرو ٹیکس بدیں نیند نہ آئی۔ بیقرار ہوا تھا، باہر نکلا۔ آسمان قدر سے اجل گیا تھا۔ ستاروں کا قافلہ گزر گیا تھا، ستارہ سحری چکتا تھا، رنگ قمری پھیکا ہوا تھا۔ اتنے میں مرغ کی بانگ بلند ہوئی اور دور کی مسجد سے اذان کی صدا اٹھی۔ میں نے دصو کر خنوں و خنثوں سے فریضہ سحری ادا کیا۔ پھر کوہ طڑی میں اگر اس گلشنِ خوبی کو جھنپھوڑا۔ وہ پھر بڑا کراں ٹھی جلدی سے یعنے کوڈھار کا اور انگھیں ملتی نکھلتی سی میلے بستر سے اٹھی۔ من ہاتھ دھویا، فریضہ سحری ادا کیا۔ پھر حملہ فرائض سے فارغ ہوا پنی انگو ٹھی آثاری کہ سونے کی ٹھی اور عقیق اس میں جٹا تھا۔ مجھے دی اور کہا کہ بازار جا کر اسے فروخت کرو اور کھانے پیسے رہنے سمنے کا بندوبست کرے۔

میں بازار میں نکلا تو عجیب ماجرا دیکھا۔ شہر شیرخوشان بنا تھا۔ بازار کھلے تھے، خرید و فروخت ہوتی تھی۔ پر کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ سودا سلف خریدنا اور چب چاپ گزر جانا۔ نہ ہنستا قہقہا نانہ بولنا چہکنا۔ میں وہ بھر بازاروں میں گھومتا پھر اور نظر عجیب دیکھتا رہا۔ شام ہوئی تو دیکھا کہ کوچہ و برباد کے سب لوگ قافلہ در قافلہ ناموش اس شہر سے باہر جاتے ہیں۔ میرا ما تھا۔ مخنکا کہ شاید اس میں کوئی بھید ہے تم بھی چلو اور قدرت الہی کا نماشا دیکھو۔ سو میں بھی تھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔

یہ پورا جمیع ایک ہیلان میں قطار در قطار کھڑا ہو گیا، مگر اسی طرح صورت تصویر خاموش۔ دفتار سب کی نظر میں ایک سخت اٹھ گیئیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فرنگی کاؤ سوارہ تھیں ننگی تلوار میں کف بھرے جوش و خروش کرتا چلا آتا ہے۔ تیچھے اس کے دوائلے بالوں والے غلام ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں بھی ننگی تواریں ہیں۔ تیچھے ان کے ایک غلام پہاڑی ہے کہ بڑا سامرتباں کا نہ تھے۔ یہ دھرے چلا آتا ہے۔ وہ فرنگی قریب اگر بیل سے اتر ایک سخت پروازیو ہو بیٹھا اور ننگی سیف سامنے رکھی۔ پھر غلاموں پہ زبان عجیب میں گر جا۔ وہ بیک جیک جمیع کی سخت آئے۔ غلام پہاڑی مرتباں سب کو دکھاتا جاتا تھا۔ دیکھنے

و اے ہر اس سے سمجھتے تھے اور انکھیں بند کر لیتے تھے۔ ایک جوان مردنے مرتباں کو دیکھ کر نعرہ مارا اور آنکھیں اس کی نرخ رکھ گئیں۔ اس پروہ فرنگی زبان عجیب میں پھر گردے جا اور اسے ہالوں والے غلاموں نے اس جوان مرد کو صفت سے الگ کر گردی ماری اور لاش کو تڑپتا چھوڑا۔ آگے کی صفت کے سامنے گئے ہیں سب سے آخر میں کھڑا یہ ماجرا دیکھتا تھا کہ اتنے میں مرتباں میرے سامنے آیا عجیب دروناک منظر دیکھا کہ کسی شہزادے کا سر ہے، زینب کا لی کالی، صورت گوری گوری ہتھیاروں سے بچا عنت پیکتی ہوئی، صورت ماہ دو ہفتہ مرتباں کی خدمت میں چکتا ہے میرا کلچہ مرنے کو آگیا، انکھوں میں خون اتر آیا، مگر مصلحت اسی میں دیکھی کہ فی الحال ضبط کر دو اور گھر چلو۔

میں نے گھر آگر اس گلشن خوبی کو یہ ماجرا نہ یاد کر دیتے تاہم میرے گلے سے پست گئی اور کانڈے ہم پر سر کھ کر بے سخا شاروں نے لگی، میں نے اسے سمجھایا، پچکارا، آنسو پوچھے، تسلی دی۔ وہ دیتک پچکیاں لیتی رہی، پھر رفت بھری آواز میں بولی «اے بیرے عُن تو جس شہزادے کا سر دیکھ کر آیا ہے وہ میرا ماں جایا ہے بیسمِ تم زده خلقت اسی بد نصیب با دشہ کی ہے جس کی یہ دختر نہ ساختہ ہے ماں جایا میرا ہنگام کا رذرا میں مارا گیا غریبوں نے سراس کا نیں سے جدا کیا اور مرتباں میں لئے۔ باب میرا زندہ گرفتار ہوا۔ اسے انہوں نے درخت سے لٹکایا اور زندہ چلایا۔»

میں نے یہ افسانہ جگر پاش سناتا انکھوں میں خون اترایا۔ مگر سمند خال آج تھا تھا، کیا کر سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ «اے شہزادی دیکھاری عنوں کی ماری، ہمارا یہاں قیام خوب نہیں، اس نگری سے نکل چلو اور کہیں دور مٹھا کانا کرو۔۔۔»

کھانی شہر بے چشم غ کی

میں نے جلدی جلدی گھوڑے کوک، گھوڑے پر اسے ساتھ بٹھا ایڑدی اور شہر سے

نکل کھڑا ہوا۔

ہرج مرچ لکھنپتے ہوئے صعوبت سفر اٹھاتے ہوئے ہم چلے چلتے تھے کہ ایک شہر میں گزر ہوا۔ اس شہر کا عجائب طور دیکھا، عمارتوں اور عمارت والوں کا رنگ اور پایا۔ جا بجا خلات و باغات شاہی مدرسہ اجڑے ہوئے اندر باہر لائون کے بخربڑے ہوئے۔ عالی شان اماں بالٹے مثل جسد امام مظلوم زخمیوں سے چور، دیلواریں گولیوں سے چلنی، توپوں کے گروں سے بھبھاتے ٹکھے ہوئے، گنبد کرے ہوئے۔ لوگ یہ پوش، خاموش، لب بند، خرمی صورت بناتے ہوئے زبان حال سے مرتبی خوانی کرتے ہوئے۔ شام پڑتی تو لوگ اسی طرح خاموش لب بند پینے اپنے گروں کو چلے اور گلی کو چھوڑتے ہوئے۔ نہ کوئی دکان کھلی تھی، نہ مکان میں چراغ جلتا تھا پورا شہر اندھیرا تھا، دن کی وہ صورت رات کی یہ کیفیت۔

میں سارے دن تماشائی بنایا تماشا شکرے غرہ دیکھتا رہا تھا، پر اب دامن ضبط رہا تھا سے جھوٹا تھا۔ بڑھ کر ایک بسر پوش بزرگ سے پوچھا «اے فیق یہ کیا ماجول پے کہ موسم عز اگزد گیا مگر تمہارے شہر نے مانگی لباس نہیں آتا را۔ بہت سا تھا کہ اس شہر کے لوگ امام شہید کا سوگ بکمال نقاوت و شاستری مناتے ہیں، عراخلنے آباد ہوتے ہیں، روشنیوں سے جگہ جاتے ہیں، امام باڑوں میں قند ملیں، مومن شمعیں، دعڑے، جھاڑ فالنوس، ہانڈ بیان بیوں جلگھاتی ہیں کہ سارے شہر میں ان سے روشنی چیلتی ہے، ہنگلی گلی جیلیں لگتی ہیں، امام نشستہ کام کی یاد میں شربت پلایا جاتا ہے۔ تو شہر باٹھا جاتا ہے۔ بیسلوں پر حلقت کا اڑ دہام ہوتا ہے۔ جو اس میں جمع غاصن و عام ہوتا ہے۔ پر یہ کون سا موسم عزم ہے کہ عز اخانے دیران ہیں۔ امام باڑے سے سکار ہیں، گلیاں انڈھیری ہیں، شہر مجھا پڑا ہے۔»

وہ سید پوش بزرگ یہ کلام سن آبیدہ ہوا اور آہ سرد بھر جھولا کہ «اے نہمان عزیز، ایہ شہر بہت غارت زده ہے۔ ایام عزیزوں تمام ہوں کہ لغزیے اب کی برس نہیں اُنھے اور مانگی پوشش کیسے اترے کہ تم اپنے جلا وطن بادشاہ کا سوگ مناتے ہیں اور شہر میں چراغ کیوں

کر جلے کہ شہر کا چراغ ہماری ملکہ شہر سے باہر ہے۔

خود شید و دخان امامت ہے سفر میں

گردش نظر آتی ہے اُسے دور قسم میں

اے عزیز توکس زمانے کا ذکر کرتا ہے۔ اب بیان کی زمین اور فلک اور ہوا کوچے پر لبط ہو گئے، گلیاں بکھر گئیں جو فیض کے دریا تھے خشک ہو گئے شہر پیاسا سا ہے۔ شہر کے چاند پر ظلم کی گٹھا چھائی ہے، شہر اندر ہیرا ہے، ہر دوڑیں جلی آتی ہیں۔ مردان حرگز فشار ہوتے ہیں۔ اور گردن مارے جاتے ہیں۔ اے عزیز توکس موسم میں ہمارے شہر آیا یہ دن وہ ہیں کہ ہمارا شہر ویران ہے، نیزی کیا خاٹ کر دیں اور کیوں کر حق نیز با فی کر دیں، ہماری ملکہ سفر میں ہیں شہر کی شہزادیوں کی خوبصورتی سے جنگل مکملتا ہے، شہر ترستا ہے۔ گرمی کے دن اور پھراؤں کی وہ راہیں رہ گو رحی موت میں سلو لازگی ہوں گی، چاند سی صحوت میں کجلازگی ہوں گی۔“

وہ مرد بزرگ ایک آہ بھر کر چب ہو گیا۔ پھر سرگوشی میں گویا ہوا۔“ اے عزیز ہماری ملکہ پھراؤں میں مولا مشکل کتنا چلے کیھنختی ہیں جب وہ پبلہ پورا ہو جائے گا تو وہاں سے پلٹیں گی، بادشاہ کو جاؤ اور کرامیں گی اور ہمارے شہر کے دن پھریں گے۔“

یہ کہا رہا بزرگ جلدی سے آگے بڑا ہو گیا اور ایک گلی میں مرد کر گم ہو گیا۔

پس آمدہ رہ بھرتا کفت افسوس متسارعے کو واپس ہوا اور گلشن خوبی سے کھا کر اے لبی، ہم شہر مگر سے نکل کر شہر پر چراغیں آئے ہیں۔ شہر والے شہر بارکو رو تے ہیں اور راتنم بک شہر ارزد کرتے ہیں۔“ یک یغنت اس شہر کی سن کرا سے اپنا شہر بادا یا اور بہت روئی۔

اے عزیز و باتیز و جب وہ گلشن خوبی روئی تھی تو میرے بد ان کے اندر رزم زخم ہاریں سی جلنے لگتی تھیں۔ سپاہیاں زندگی کی بخاری فندہ اتر جاتی اور ہیں سراپا ایک دھڑکتا ہوادل بہ جلنی پچھلتی لوں جاتا۔ یک یغنت آج تجھ پر اس شندت سے طاری ہوئی کہ جن بناۓ نہ بنی۔ پڑیں نے اپنے دل کے حال کا اظہار بر ملا کر نامناسب نہ جانا اور یوں جہا زن بنایا کہ اے

نیک بخت، اس شہر متبرک میں آج ہمیں پہلی رات ہے۔ تیری پاک دامنی ثابت، تیری عصمت بنی اسمٰم
پر بندہ بشر ہے، برائی کا ہر گھر ہی ڈڑ ہے۔ بدی انسان کے خیریں داخل ہے اور خون بن کر
رگوں میں دوڑتی ہے، جب جسم جاگتا ہے اور خون پکارتا ہے تو یہ تلوار کی گز بھر کی دیوار کیا کیا
چیز ہے۔ قبیلہ اور دین و ندیہب کی استوار کی ہوتی دیواریں مثل حن اس کی رو میں بہتی دیکھی
گئی ہیں۔ کیا ستم ہے کہ دلوں میں وصل ہے اور جسموں میں فصل ہے جب دوری ہے تو یہ قرب
کیوں اور یہ قرب ہے تو دوری کیوں؟“

یہ کلام سن کرو، بہت مخوب ہوئی بھرہ شرم سے گلابی ہو گیا، من سے کچھ نہ بٹوں میں نے
دل میں اپنے تینیں طامت کی کہ سپاہی زادے تلوار کے دار خوب جانتا ہے۔ بخت کے
راوی پیچ سے مخفی نا آشنا ہے۔ وارا وچھا پڑا، آفر چوت کھائی میں ابھی سوچتا تھا کہ وہ
بے تا با نہ میر سے ملے لگ گئی اور چکیاں لے رونے لگی۔ میں سمجھا کہ جنت مل گئی، ملے
نہیں لگتا، ہوں بہشت میں گلگشت کرتا ہوں سگر اس نے ایسا اور پیچ دالا۔ بولی کر اے
میرے بھن تو نے یہ کیا سوال کر دالا اور مجھے آزمائش میں بھنسایا۔ میرے شہر کا سماں لٹ
گیا، میری جو بیکی کی آبرومت گئی، میں کیوں کر تخت عدی پر بیٹھوں۔ میں نے یہ عمد کیا تھا کہ
اس سورماکی کنیز بنوں گی جو میرے باپ بھائی کے خون کا بد لے لے اور میرے شہر کو پنجہ فرنگ
سے نکال لے۔“

اس کلام کی اس سے سن میری سپاہیانہ غیرت نے جوش کھایا، اپنا بھولا ہوا فریضہ یاد آیا،
بولادا اے نیک بخت تو نے میری آنکھیں کھوں دیں۔ بخت خاں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ کہ
سندھ خاں فتنہ فرنگ کے خلاف اٹھی ہوئی تلوار نیام میں نہ جائے گی۔ فرنگیوں کے جسم اس کے
نیام نہیں گے میں اس قول کو شہستان بخت میں بھول چلا تھا تو نے مجھے یاد دلایا اس میں
بخت خاں کی تلاش میں نکلتا ہوں کرو مقرر شیر شاہی بینار کی تلاش میں ہو گا۔ جب فتنے کے
کی آواز تیرے کان میں آئے تو جانا کہ تیرے باپ بھائی کے انتقام کا وقت آیا اور فتنہ فرنگ ملا،

وہ رات ہماری آخری رات تھی۔ رات کے سکن بھر کی راتوں کی سوچتے رہے اور اُنے
واٹے وصال کے محوں کی پاتیں کرتے رہے۔ جانے کس وقت سوئے اور کیسے سر نے کو دریاں
میں نوار رکھنا بھی بھول گئے۔

سفر سر پہ سخاڑ تھا۔ تڑ کے آنکھ کھل گئی۔ جانا کہ مس کا ایک ٹلسہم تھا کہ ٹوٹ گیا۔ خلکی سیر
کرتا تھا کہ زکار لگایا۔ تاروں کی چھاؤں میں گھوڑے کو کسا، اس گلشنِ خوبی کے رکابا، اور گھوڑے پہ
سوار ہو سفر پہ چلا۔

شہر سے نکلا تو فخر ہو چکی تھی پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش ہو چکی تھی، اب ترش ہوتا
تھا مدد سے صدا آتی تھی:

ندی نزد اکا جل گر جے گر جے گنگا کی دھار
بر سات لگ چکی تھی۔ آج ساون کی پہلی بھر طری تھی۔ آخھا دوں پڑھی جاتی تھی۔
سمندر خاں یہاں تک منا کر خاموش ہو گیا۔ دیر تک اسی ہڑح دوزانو بیٹھا رہا مسوات
تصویر خاموش حاضر بن سکتے میں تھے پھر بولا، اسے عزیزو، بخت خاں ابھی زندھ ہے اور
شیرشا، ہی بینار کی جستجو میں ہے جب تقارے کی آواز کاں میں آئے تو جانما کم بخت خاں
کے شکر کے کوچ کا وقت آیا اور سمندر خاں تھماری گلی سے اٹھا،

سمندر خاں جلدی سے اٹھا اور نظرہ لگاتا ہوا مطلب سے نکل گیا۔

ندی نزد اکا جل گر جے گر جے گنگا کی دھار
اس کے بعد ہم نے سمندر خاں کو نہیں دیکھا۔

حکیم جی چبب ہو گئے۔ عنی، صدیق، نصیر، عدالت علی بھی خاموش ہو گئے۔

پھر عنی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا د کہاں گیا وہ۔

«اللہ جانے»، حکیم جی بولے «اللہ جانے کہاں گیا، خاموش ہوئے، پھر بولے» اس
رات ہماری گلی میں بہت گرفتاریاں ہوئیں، میرے پاس بھی کوتوال آیا تھا، مگر اپنا شہر میں

اسپیار نخا سوچ گیا۔“

عدالت علی خاموش حق پیتے رہے۔ پھر نے حکیم جی کی طرف موڑ دی۔

غنی بولا۔“ حکیم جی، بخت خان سچ پچ زندہ ہے؟ ”

حکیم جی نے نے کو ہونٹوں میں لیتے لیتے چھوڑا، لوٹ کئے یہی ہیں کہ بخت خان اب
نہ ک زندہ ہے۔“

”مگر کیسے زندہ ہے؟ صداق نے سوال کیا۔

حکیم جی بولے ”دوسٹو، دنیا جرت کا کار فائن ہے۔ زندگی طلسہ ہوش ربا ہے۔ اس کا رخانے
کا راز کس نے پایا اور اس طلسہ کا بھید کس نے بوجھا۔ یوں موت سے کسی کو رستگاری نہیں
جو آیا ہے وہ جائے گا۔ پر قدرت بھی کبھی یہ شعبدہ بھی دکھاتی ہے کہ موت کو زندگی کے
 مقابلے میں ہمارتی ہراتی ہے یوں سناء ہے کہ جب بخت خان دل سے رکلا تھا تو ایک قرب
سے گزرتے ہوئے ایک گھوڑے کی ہنہنلنے کی صدائی عجیب اس کے کان میں آئی تھی
مگر اس نے اس صداب پر غور نہیں کیا اور آگے بڑھ گیا۔ تب ایک فیرار سے راہ میں ملا اور
لارڈ بخت خان تیرا بخت برآ ہو کہ ٹیپو کے گھوڑے کی صداتھ نے نہیں سنی۔ تیری فتح کا وقت
مل گیا۔ اب گردش دوڑاں تجھے دشت دشت آوارہ پھر لے گی اور پھاڑوں میں خراب
کرے گی۔ پر تو اس آواز کے باعث موت کے چکر سے نکل گیا ہے کہ جب پھر پہ آدا کئے
تو کان دھرننا اور اس سمت جانا۔“

غنی نے پڑھا۔“ حکیم جی، ٹیپو سلطان کے گھوڑے کی یہ کیا کہانی ہے۔ وہ قریب کو نساقر یہ
تھا۔ وہ آوانہ کسی آوانہ تھی۔

حکیم جی بولے ”دوستو یہ کہانی لمبی ہے اور رات چھوٹی ہے۔ مگر بارہ کا سچ گیا۔

پسند کا بلا واؤ آگئا۔ آج کی رات کے لئے یہ سچا برخاست کرو جو۔

کل رات کو اب ختم یہ افسانہ کرے گے

چھوڑے کی ندا

ایک دن وہ سوپ ازٹا قے کی پڑھی، دوسرا دن باول گھر کر آئے اور برس پڑے، رات کو چار پاساں پھر اندر چل گئیں اور سونے والے منی کی راتوں میں چھتوں کے پنجے رعنائیاں تان کر سوئے۔ موسم کا یہ غنا دلیسر کی دلنشتی میں ایم ڈم کا کرشمہ تھا۔ غنی کتابخاکہ موسم کسی ملک میں سدا ایک سے نہیں رہتے۔ صدیوں موبموں کا دوریوں چلتا ہے کہ کبھی نہیں ٹوٹے گا اور پھر لوٹ جاتا ہے مگر حدالت علی کے تینیں یہ قبر کی صورت تھیں۔ ایک ایم ڈم چھوٹنے سے جاڑے کر می برسات سب کافر بینے بگرد جاتے۔ غفل نہیں مانتی تر، حکیم جی کرتے تھے، چلومن لیا کہ ایم ڈم سے موبموں کافر بینے بگرد گیا مگر بجا تی آسمان پر یہ کیا ہوا ہے کبھی رات کو آسمان کی طرف بجھی دیکھا کر وکھ وہاں ان دلوں کیا کہرام پہاڑے۔ دم بد مردارے لوتتے ہیں کیا آسمان پر کسی نے ایم ڈم چھوڑ دیا ہے؟ جب دلدار ستارے کی خبر آئی تو ان کی دلیل کو اور تعقیب حاصل ہو گئی۔ «عدالت علی کو یاد ہو نہ ہو، ہم نے جاؤں میں آسمان کو دیکھ کے کہہ دیا تھا کہ بھائی سن نتاون آرہا ہے، آثار لچھے نہیں۔» پھر رات کو مرتخی انکارے کی طرح دیکھا تھا میاں، ہماری یہ عمر ہونے کو آئی بجھی، ہم نے مرتخی کو بیوں بھیلیتے دیکھا۔ وہ تو ایسے بھل ہاں تھا کہ میں تھا سوچ کے برابر ہو جائے گا۔ اب مرتخی میں ایم ڈم کس نے چھوڑ دیا؟ اور حکیم جی کا تھیل بہکنے لگتا۔ حاضر کی حدیں پھلانگ کر راضی کی دنیا میں کہیں سیچتا۔ گزری ہوئی باتیں اور یادیں، اور ہبسی داستانیں بھولے ہوئے لوگ، ڈور کا ایک سر امل باننا اور پھر ہر میل کھلتی چلی جاتی۔ طوٹے میاں کے والد عما مسر پر رکھے، عبادوں پر ڈالے عصا میکے بیچ صحمن میں کھڑے ہیں اور ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ طوٹے میاں آم کے درخت کے پنجے بیچھے ہوئے، کبھی طوطوں کو روٹی کے ٹکڑے کھلاتے ہوئے کبھی اردو گرد بیچھے ہوؤں کو اپنے مرکے سنتے ہوئے۔ ڈاستان اور حقیقت کے درمیان وہ جو باریک سافر قہوتا ہے

وہ حکیم جی کے ذہن میں تقریباً مٹ چکا تھا۔ داستانوں اور قصوں کے جلنے کتنے منظر اور کتنے
دوگ داستانوں سے نکل کر ان کے لئے دیکھی سمجھا لی چیزیں بن گئے تھے اور کتنے واقعات تھے
کہ ان کے نزدیک شخص افسانے تھے۔ طوٹے میاں کے والد کراہنؤں نے ہمیشہ یہ جانا کہ انہیں
اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے حالانکہ انہوں نے تو بس ان کا قصہ طوٹے میاں سے سن تھا اور طوٹے میاں
ان کا ذکر حکیم جی یوں کرتے گویا کوئی داستان سناتے ہیں حالانکہ انہیں انہوں نے چلتے پھر تے
اور بولتے چلتے دیکھا تھا بلیے لگ لگ سے بکھی ضرور جیں ہوں گے مگر اب ہمیشہ یوں کی مالا تھے
ذگ و روپ بگڑا جچکا تھا، بس آنکھوں میں دم باقی تھا۔ دُبیلے پتے چھڑی ایسے بدناگ
گوری جلد پہ جھریاں بڑی ہو گیں، بڑی بڑی اکجیس، سفید بال، عربی پتے رکھے ہوئے لیکن میں
میں گندھے ہوئے۔ شہر سے باہر کر بلا کے جھرے میں رہتے تھے۔ جھرے میں قیام برائے نام تھا
جھرے کے مقابل والے آہ کے پیر کے پیچے بسرا م تھا۔ رات کو ستاروں کو تکتے رہنے آموں
کے دنوں میں کر بلا والے باغ میں دن بھر گوپیا گھومتی اور طوٹوں کو اڑایا جاتا۔ طوٹوں کی
ڈاریں گھنیٹ خون سے نکل کر سبز لمکتی دھاریاں بن کر فضنا میں چھیل جاتیں اور پھر طوٹے میاں
کے پیر پر اتر پر ڈین کبھی کسی رکھواں کی بیرونی کے طوٹوں کو اس درخت سے اٹا آتا۔
بستی والے بہت کھانے کر آتے مگر طوٹے میاں کے حصے کا رزق اس میں کم ہوتا کچھ کر بلا
کے آس پاس پڑے ہوئے محتاجوں کو ملتا، کچھ ان سندوں کے پیٹ میں پہنچا جو کر بلا کے
سیاہ ہوتے خستہ برجوں پر جھولتے رہتے کچھ ملکر نے اس کے کے پیٹ میں جاتے جو راتوں
کو کبھی باغ میں کبھی باغ سے دُور جھونکتا پھر ترا اور طوٹے میاں کے مراقبہ میں سخت مغل
ڈالتا۔ باقی اس جنگل کے طوٹوں کا رزق نہجا۔ طوٹے میاں رات کے کھانے میں سب سے بہت
سی روٹیاں پچالیتے اور جب فخر کا تارا مخودار ہوتا تو ان باسی روٹیوں کو ہاتھ لگاتے۔
ان کے چھوٹے چھوٹے ریزے کرتے۔ یہ شغل جاری رہتا۔ بہانہ کہ کا لوںس آسمان سے
وحلنے لگتی اور درختوں پر دھنڈلا دھنڈلا سفید غبار نظر آتا اور طوٹے قریب و دور کے درختوں

خدا اڑاکر آتے اور طوٹے میاں کے گرد چک پھر یاں کامنے لگتے۔ چینیتے چلتے طوٹوں کی ڈاریں زمین میں بچھی ہوتیں۔ درمیان میں طوٹے میاں کھڑے ہوتے ہوئے مولیٰ کے دیزے پر بھر مٹی بکھرتے ہوئے! کوئی طوٹا بے قرار ہو کر ڈار سے پھر طوٹے میاں کے کامنے پر آبیختا ہے اور لمبی دم اس کی طوٹے میاں کے کان کو چھوٹے لگتی ہے، پھر وہاں کچھ نہ پا کر پھر زمین میں پھرتے ہوئے طوٹوں میں جا شاہل ہوتا ہے۔ حکمِ حی کی آنکھوں کے سامنے وہ پورا منتظر آ جاتا۔ پھر انہیں دو دن، وہ درخت، ان درختوں کے پرندے یاد آنے لگتے۔ طوٹے میاں کی باتیں یاد کرنے لگتیں۔

”میاں اب یہ باتیں کہاں؟“ حکمِ حی سوچتے سوچتے اپدھی افسر دہ ہو جاتے۔ ”وہ لوگ رہے نہ وہ محلتیں مر و میں رہیں۔ اب تو ادمی ادمی بیس غیریت ہے، پرندوں بے چاروں کی تو ہستی کیا ہے؟“ چبپ، ہوجلتے پھر ٹھنڈا انس بھرتے۔ ”ایسے طوٹا چشم ہو گئے ہیں۔ لوگ کہ کوئی مرتا ہو تو حلق میں بوند پانی کی نڈا لیں، پڑوس میں میت پڑی ہو تو کامنہ نہ دیں۔“ حکمِ حی ٹھنڈا انس بھر کر پھر حبپ ہو جاتے اور لمبی چبپ سادھیتے۔ وہ پھر کسی دور کی وینا میں نکل جاتے۔ طوٹے میاں کا کرب بلا کے اس پاس پڑتے فقروں کی خبر گیری کرنا، بیمار پڑیں تو دعا دار کرنا، درخت درخت طوٹوں کی خر لیتے پھر نایاد آتا۔ پھر ان کے ذہن میں وہ واقعہ اُبھرنے لگتا کہ صحیح ہی صحیح جب طوٹے میاں طوٹوں کو روٹی کے گردے کھلانے شروع ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آم کے پریٹلے علیں اس پودے کے نیچے جس کی ٹکھیں میں ایک طوٹے کا گھوسلہ تھا۔ طوٹا لکڑی کی طرح سخت مرا پڑا ہے۔ شاید اسے سانپ سونگھ گیا تھا طوٹے میاں اس روذہ بہت ملوں اور بہت مصروف رہے۔ صحیح ہی صحیح شرگئے۔ لوگوں نے انہیں دیکھا تو بہت چیران ہوتے کہ طوٹے میاں نے آج کر بلکہ کی چیک کیوں جھوڑی اور شر کیسے آئے۔ طوٹے میاں نے اکنی اکنی دوانی دوانی بازار والوں سے چندہ جمع کیا پھر لٹھا اور کافر خریدا۔ واپس آئے، میت کی تحریر و تکفین کی۔ آم کے پیرڑ کے نیچے تدبیں ہوئی اور طوٹے میاں شام تک قبر پر بیٹھے قرآن خوانی کرتے رہے۔

”اس روز جب ہم مات کوان کے پاس جا کر بیٹھے، حکیم جی افسر دہ لجھ میں کھنے لگے تو انہیں بہت طول پایا۔ اذل سکر طبیعت بھری ہوئی تھی، ہماری بالتوں پہ بجھنے لگے اور اپنی داستان سے بیٹھے۔ عجب طور کی داستان تھی کہ، ہم بھی طول ہو گئے۔ وہ رات ہم سب میں پہ بھاری گزری“
”اُن صاحبِ آدمی وہ عجب تھا۔“ عدالت علی بولے۔

”مگر بھائی یہ مظہرے نئی روشنی کے لوگ،“ حکیم جی نے عنی اور نصیر کی طرف اشارہ کیا۔
”انہیں تو اس کا قصد بے سرو پا نظر آئے گا۔“

عدالت علی بولے ”حکیم جی، ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جو قصہ سچا ہوتا ہے بہت سے مرد پا لگتا ہے۔“

عنی اور نصیر نے جب یہ قصد سننے پر اصرار کیا تو پھر حکیم جی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ حقیقت کے لمبے گھونٹ لئے پھر اسے مخدابِ ثواب کرنے والے کی گردان پر حاشا و کلام میں نے اپنی طرف سے اس میں ایک لفظ شامل نہیں کیا ہے جو سما وہ عرض کرتا ہوں۔ طوطے شاہ کی طبیعت میں طوطے کی ہوت نے گدا پیدا کر دیا تھا۔ زندگی کی ناپائیداری اور زمانے کی لئے شباتی کا ذکر کرتے کرتے انہوں نے اپنا ذکر شروع کر دیا۔

داستان طوطے میاں کی

صاحبوا، آج ہم خاک بسر چھرتے ہیں۔ کل ہم شہرِ گل کی زینت تھے۔ نازوں میں پلتے تھے۔ پھولوں میں تلتے تھے۔ اس شہر کا قصدِ شیندی ہے کہ جسمِ فلک نے دنیا کے نجت پر کام ہے کو ایسا چمن پھوٹے دیکھا ہو گا۔ راہیں خوشبو محلے گلزار، گلیاں معین، بازار منورستے کھوار بجاتے ہیں، چھا گلیں لئے چھرتے ہیں۔ بزاری ہزاری روں تک کی گرم بازاری، دکانوں میں قیمتی اشیاء بھی ہیں۔ چاند نیاں پچھی ہیں۔ دم کے دم میں لاکھوں کا مول ہوتا ہے مول کرنے والے دولت کو ہاتھ کا میل جانتے ہیں، مال اسباب خریدتے ہیں، ناجروں کو

مالا مال کرتے ہیں جو مال نہیں رکھتے وہ دل کا سودا کرتے ہیں۔ دولت کی گنگا کے پہلوہ بہلو
حسن کی جمنا بہنی ہے سویرے منڈھیرے چاند ایسے چھرے آنکھوں میں بیٹھی نیند بھرے کچھ
سوئے کچھ جاتے، قدم لڑکھرتے، جمایاں لیتے، آنکھیں ملتے موج موج گھاث کی طرف جلتے
ہیں۔ اشناں کی کیاشان ہے کہ گھاث پر سونا اللہ اے، پانی کی بچھلی چاندی میں نسلے اترتے
ہیں، بیجھی سارہ ھیوں میں کندن بدن رکھتے ہیں۔ سیکن ساقیں ریشمیں ساعدیں دھل کر چمک
مارتی ہیں۔ ہمین سارہ ھیوں کے نثار درآپنچل کیسے پڑتے ہیں، آنکھیں چک کر گلابی جو نبیوں
کو دملاتے ہیں۔ جو نبیوں کے گلاب چھوے ہیں، گلابی عالم الگ بہار دھملاتے ہیں گھڑے
رس کے بھرے چور لکھیں لے نہ سکیں۔ امی جی کازما نہ تھا صبح خیز یوں جو لوں، اچکوں کا بازار
سرد تھلا عزت داروں کی عربت وضع داروں کی وضع قائم تھی۔

ہم جوانی کے نشے میں سرشار مسٹر اشتیاں کرتے تھے۔ کبوتر زلاتے تھے۔ کیا کیا کبوتر زخم
باتھا۔ جب بھرا لھا کر ٹکڑی اڑتی تھی تو جانو کر گھنٹھوڑکھٹا اٹھتی تھی۔ صاحب، مبالغہ نہ
جانا، جب دھوپ تیزا اور گرمی سخت، ہوتی تھی تو والدہ حضرت فرمائیں کہ بٹا کبوتر ذرا
چھوڑ دو۔ کچا اٹا کہ خاص کبوتروں کے لئے بنوایا تھا اس کا دروازہ کھولتا اور کبوتروں کے
دل باہر پھیٹھاتے یوں نکلتے کہ باول اٹھ رہے ہیں اور دم کے دم میں آنکن میں جھاؤ
ہو جاتی۔ ہوا کبھی بندہ ہوتی تو بھر والدہ حضرت فرمائیں کہ بٹا ہوا بندہ ہے کبوتر کھولو اور جب
کبوتر کھلتے تو جانو کر پسکھے کھلتے اور بازوؤں سے وہ مٹھنڈی ہوا پیدا ہوتی کہ پسینے سے
نشرالبور بدن شکعتہ ہو جاتے۔

صاحب، وہ کبوتر، ہم سے چھٹ گئے۔ لقا، لوٹن، گولا، جو گیا، متیرازی، کلامی، ملسی،
لقد طرح رنگ برنگ کبوتروں سے بھرا کوٹھا اسی طرح چھوڑ آئے اور اب اپنی
بھڑر سے جدا، اپنی بھڑری سے دور بھٹکتے ہیں اور اوپنی چھتوں کو ترستے ہیں، اس آسمان
کے لئے بھڑکتے ہیں۔ مہینہ دو ماہ پہلے کا تھا، جاڑ سے کی سوراہی جاتی تھی۔ دن اور رات

کافر کم ہوتا جاتا تھا اسے صاحبو وہ موسموں کا ملنا اور دن اور رات کا برابر ہو وصل کرنا قیامت ہوتا ہے۔ ماہ مارچ پر غور کرو کہ کیونکر بر بادی اور آبادی کا حیل پہلو یہ پہلو حیل جاتا ہے ملتے موسم کیا نیز نگی دکھاتے ہیں کہ ایک شحر پر شریہ ہماری بارات چڑھی ہے۔ تاخوں نے بچوں لوں کا گھنا پہنا ہے، پتوں میں تاشا بابا جا بختا ہے۔ بغل میں اس کے بخرا ایک دوسرا ہے، بے شربے برگ و بر، سر بر ہنہ بے بلوس شاخیں سوئے فلک تکیتی ہیں اور کسی کسی شہنشی سے ہلاکوئی پتا، زرد و غمزدہ، ان ان گشت رفیقوں کو یاد کر رکھ ملتا ہے جو قافلہ در قافلہ شاخوں کی بستیوں سے رخصت ہوتے اور اب زمین کی بستی میں در بدر خاک بسر نوحہ بلپ بھلکتے پھرتے ہیں اور جہاں جا پاتے ہیں سر سے سر جوڑ جمع ہو ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

جمیلہ وہ مارچ کا تھا اسے صاحبو جاڑا بھی بہت ستاتھے پر گلا بی جاڑا اقہر ہے کتنی کہانیاں ساختہ لاتا ہے کتنی کہانیاں ساختہے جاتا ہے۔ سب سنت دن ہوتے گزر چکی عتی ہولی ابھی جلی بختی اور سونے والے بند کو ٹھوں سے نکل دالانوں میں آگئے تھے۔ آہوں کے باعزوں میں ہر سکے خوشبو نیرتی رہتی اور بھوڑے مول کے بچوں کے گرد منڈلاتے مجنبخاتے رہتے۔ وہ جمیلہ مارچ کا تھا اور دن وہ نوروز کا تھا۔ دھوپ ڈھلنے لگی بختی چوکی چھاؤں میں بچھی بختی۔ صحن صاف، چوکی شنافت، اجلی چاندنی، اجلی چاندنی پہ اجلانہا و تیکرہ والدہ ملائے لوز رانی چہرہ برف زنگ ریش سفیدہ لباس، دو پیلوٹی سرپر عبادو ش پر، دوز انویں بھٹھے تھے ہاتھ میں جنتری کھلی بختی اور سامنے ایک نسل اپانی سے بھرا کہ بڑا چھوٹ ایک گلاب کا پڑا اس میں تبر تانخا۔ ایک طرف گلاب کے بچوں سے بھرا طشت، دوسری طرف ابلے سفید چینی کے ایک طشت میں یہیہ کے کانٹے کا بنافلم، برابر میں چینی کی پیا لی گلے زعفران سے بھری اور برابر میں اس کے سفید کاغذ کے پُر زے، بڑی کوڑی ان پہ دھری ہوئی۔ جانتا چاہیئے کہ والدہ ہمارے بڑے عامل تھے اور بخوم وجھر میں درک رکھتے تھے۔ برس کے برس بروز نوروز اسی وضع تشریف فرماتے اور جب ساعت خاص

نوروز کی پہنچنی اور لگن میں تیرتا گلاب دفتا چکر کھاتا تو وہ دوز انو ہوز عفرانی روشنائی سے سفید کاغذ پر تعویز لکھتے۔

ہاں تو جنتری ان کے ہاتھ میں کھلی بخنی۔ چہرے پر رشوشیش کے آثار تھے جنتری دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے، نوروز کا زنگ اب کے سڑک تھے۔ ہاتھ میں نوارِ شیر پہ سوا رائیا ہے وہ والدِ احمد کی زبانِ مبارک سے بہ کھات سن کر دل جانے کیوں دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ مگر چہرہ ہم شغل سے لگ گئے زنگ کی پچکاری نئے اندر باہر نوروز بھیتے۔ چہرے تھے جو سامنے آ جاتا تھا بے دھڑک رنگ کی پچکاری اس پر چھوڑتے تھے اور قہقہہ گاتے تھے۔ ہم نے آدم دیکھا نہ تا دُ، اس پر بھی اے صاحبو، ہم یہ بتانا بھوول گئے کہ جس محلے میں ہے ملا مگر تھا۔ اسی محلے میں ایک حکیم ضامن علی رہتے تھے۔ گورے چٹے، دھرا بدن۔ سدا محل پہنچتے تھے۔ ماہوں کے جاڑوں میں بھی سی طور دیکھا کہ خالی محل کا کرتے پہنچنے مطلب کرتے ہیں اور برف میں بکی کچی صراحی کا پانی پہنچتے تھے۔ گھر میں پچھے، دھرا بدن۔ قدا و پنا بدن چھر رہا، چہرہ گلابی نقشہ کتابی، ما تھا کشادہ، امکھیں بڑی بڑی، زلفیں گھنی گھنی سدا سفید چکن پہنتی ماسوا موسک عرب اکے کہ ان ایام میں وہ شعلہ جسم سیب پوش ہوتا اور ہتھا بایسا چہرہ خوب دیکھتا۔ ساتھ کھلتے بڑے ہوئے تھے اور ایکلے دیکھیے ساتھ رہے تھے سودا سیان میں نہ کوئی جواب تھا نہ روک ٹوک بخنی پر فدا استغور نہ تھا کہ کیوں ساتھ کھلتے ہیں ہاں جب کھونے سے کھوا بھجو جانا تو جی چاہتا کہ ایک بار چھر جھجو جانے اور باشت سے باشت ناپتے تو چھر بار بار ناپتے اور جان کرٹے کہ کس کی باشت یہی ہے تو اس روز بھی بے شعوری ہی میں سب کچھ ہوا۔ ہم نے زنگ بھری پچکاری آدم دیکھا نہ تا دُ اس پر چھوڑ دی وہ چہرہ زنگ سے بھیگا اور ہمکا سفید لباس نہ را بور ہو شانے اور سینے سے چپکا اور گورا بدن اندر سے چھل کا تو دل بہت چھل کا اوز جی چاپا کہ چکاری کی دھار لگا تار جلی ہے اور رنگ

چھکتا رہے کہ زمین وہ سماں اس میں بہہ جائیں پر وہ لذت ایک ساعت کی بھی کریکا یک نظر
والد ما جدر پر پڑی جہنوں نے نظریں اٹھا کر، میں دیکھا اور بغیر کچھ کہے پھر جنسری پر نظر جمالی وہ
لذت اس نظر کے ساختہ بھہ گئی۔ پچکاری مانند میں بھی کچھی کی بھی رہ گئی۔ دل بیٹھنے لگا۔

اس روز سے آمد و رفت اس ملاقات کی گھر میں ہمارے بندہ ہوئی، جی کو ہمارے روگ رکا۔

کسی کام میں دل نہ لکھا سون بھر کو عٹے پہ بیٹھا رہتا اور کبوتر اڑاتا رہتا۔ کبوتروں کے ساختہ تکاہیں
آسمان پر بھیکتی رہتیں۔ مگر بھر آسمان بھی نگہ ہونے لگا اور نگہ ہوتے ہوتے اپنے نیں
مانند بھنڈ صور کے رہ گیا۔ صاحبو آسمان ان دونوں اپنی زدیں تھا۔ نشیب و فراز اس کی زگاہ
میں تھے۔ ان دونوں آسمان نے بہت زنگ بدھے اور ستارے ان گنت لوٹے۔ رات بھرتے
بیوں لوٹتے گویا لوپوں کے گوے چلتے ہیں اور آسمانوں میں کوئی معکرہ پڑتا ہے لگتا کہ ایک بک
گر کے ستارے ٹھنڈے پرٹ جائیں گے اور دشت نلک خالی ہو کر ہو خن کرے گا۔ والد حضرت
کو زور تشویش بھی۔ ہر مرتبہ جب ستارہ ٹوٹتا تو لا حول پر ٹھیں، کانپ جاتیں اور یہ شوشاںک
ملکہ زبان پر لاتیں کہ: «بی بی اللہ اپنا رحم کرے۔ کچھ ہونے والا ہے» اور میرے پدر بزرگوار
عطا کے کریم پیغمبر میں کھڑے ہو جانے عصا طینکے نگاہ سوئے آسمان کے گھنٹوں ساکت و
صامت کھڑے رہتے گویا ٹھنڈے سے ہوتے ستاروں کا شمار کرتے ہیں یا باقیوں کی تعداد کرتے
ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایک روز سوال کیا کہ: «اے پدر بزرگوار آپ یہ کیسی چیز کشی کرتے
ہیں کہ رات گئے ہاں ایک پھوکھڑے ستاروں کو لکھتے رہتے ہیں۔ وہاں آپ کیا دیکھتے ہیں
اور ستارے آپ سے کیا کہتے ہیں۔»

تب پدر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بھرے کہ: «اے پسر! جو کچھ زمین پر ہوا جاتا ہے
وہ میں آسمان پر دیکھتا ہوں، ستاروں کا عالم بیکراں ہے، ان کی گردش فساد زمین وہاں
ہے۔ اس زمین پر جتنے ساحل ہیں اور ساحلوں پر جتنے کلکھ پتھر ہیں اتنے آسمان پر ستارے
ہیں کہ مانند سفینوں کے آسمان کے سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں مگر کیا انتظام ہے کہ زمین پس

میں لگراتے ہیں نہ برابر سے گز رستے ہیں۔ فاصلہ بخوبم کا ہر مسافر اکیلا ہے کہ بے شکھی ساتھی ہے تو شہزادہ جیراں جیراں بیا بانِ فلک میں بھیکتا پھرتا ہے اور گناہ بے منزل راستوں کو طے کرتا چلا جاتا ہے کتنے مسافر ہیں کہ بیا بانِ فلک میں جانے کو حرم گئے۔ بلکہ نشان ان کے جوں کے توں باقی ہیں اور منور خوشبوان کی اسی طرف نصایم تیرتی ہے۔ اے جان پدر ان سدھارے ہوئے مسافروں کی منور خوشبو سے آسمان جملک کرتا ہے اور زمین کے مسافروں کو کہ رات کو سفر کرتے ہیں رستہ دکھاتا ہے۔“

پدر بزرگوار کی بات بھی نے کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی پر اس راہ مجھے ستارہ اپنا بادا بایا کہ انکھوں سے او جھل تھا پر منور خوشبو اس کی سینے کے آسمان میں تیرتی تھی اور اسے عرش منور بنائے ہوئے تھی۔ بھر سے سو باری گلی میں آنا، ادھر جانا اور جیراں ہونا اور بیٹ کر بھر آ جانا، پھر کبتوں کے بھانے کو تھے پہ جانا اور اس بام بند اور اس زینے کو تکتے رہنا پر ہماری قسمت کے ستارے کی نمود کسی صورت نہ ہوتی اور فلک پر ستارے اسی طور گوتے رہے اور صارے والدراہی وضع عصاکر سے طبیعے آسمان کو رات گئے تھے رکھتے رہے تا انکہ مدینہ سنبھر کا آن پہنچا مونکوں کے وصال و فراق کا مدینہ صاحبو وہ سنبھر ہی کی شب تھی۔ اس شب پدر بزرگوار بہت رات نکل مجن میں کھڑے رہے پھر مجن سے کوئی پرچلے گئے اور اونچی منڈپ پر یہ عصاکر کے ایک پہلو پر کھڑے ساکت و صامت دیز نکل سوئے فلک دیکھتے رہے۔ اس شب آسمان پر بہت کہراں چا اور ستارے کچھ تباشوں کی طرح ٹوٹے۔ پھر ایک بہت بڑا ستارہ ٹوٹا کہ چکا چوند سے اس کی سارا شہر چونک اٹھا اور سونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ پدر بزرگوار منڈپ سے اتر آئے۔ آہستہ آہستہ کہتے جاتے تھے وَ تَعْرِمَ قَشَا وَ شَرَلَ مَنْ نَشَ

اور زینے سے اترتے جاتے تھے۔ پھر وہ مجن سے گزر کر اپنے جھرے میں چلے گئے اور نجع ایک بحد سے میں پڑے رہے۔

صاحب اس رات کے بعد سے حضرت والد صاحب جھرے سے نہیں نکلے۔ بحد سے اور

تمام اوت قرآن ان کا وظیفہ مھٹھرا دن اور رات اسی وظیفے میں گزرتے۔ جانماز بچھی ہوئی رحل شرف پر کلام پاک رکھا ہوا اور پرے اس سے ننگی سیت ہھری ہوئی، سید ریش آنسوؤں میں نزدیک رفت کی کیفیت طاری، زبان پر آیات قرآنی جاری۔

ایک روز عجب ہوا۔ والدہ حضرت تظر کے سے بے آرام ہو گیں۔ جھرے کا دروازہ جا لکھ دیا۔

پدر نے جھرے کی کندھی کھولی اور والدہ حضرت کو دیکھا کہ مثل بید کا نیتی ہیں اور انکھوں سے آنسو جاری ہیں فرمائیں «اللہ رحم کرے۔ جلالی خواب دیکھا ہے دیکھا کہ بہت لمبا جلوس ہے، اس کھلے ہوتے گریبان پھٹے ہوتے بڑا علم رکھتا ہے۔ خون اس سے پیکا ہے» والدہ اجدر نے تعبیر اس خواب کی کچھ نہ دی اور زبان سے کوئی حکم ارشاد نہ فرمایا۔ ہندی سانس بھری و تعر من تشاء و نزل من تشا و کہا اور پھر کلام پاک پر جلا کر گئے۔

والدہ حضرت ڈولی کر اکر جھپوٹی درگاہ پہنچیں اور ضریح کو پکڑ کر دن بھر روئی رہیں مگر پچھے نتیجہ نہ لکھا۔ جب دونوں وقت ملتے تھے اور درگاہ میں قذریں روشن ہوئیں تو اس جانب کو غنودگی آگئی۔ دفعنا طالبوں کی آواز کان میں آئی کہ ساری درگاہ گوش گئی اور درودیوں پر رعب و جلال طاری ہو گیا۔ والدہ حضرت ہھر برطا کر اٹھ بھیں مگر سواری گز چکی۔ سخنی۔ امام باڑے کے پکے فرش پر سکم کا ایک بڑا سانشان دکھانی دے رہا تھا کہ مثل بر کے صنو دے رہا تھا۔ والدہ حضرت نے قدم مشریف کو لو سہ دیا۔ پھر برڑے علم کا پیکا اپنی انکھوں سے مل کر بہت گری کیا اور رات پڑے مٹھن و آسودہ گھر واپس آئیں اور آرام کیا۔

صاحبہ یہ ماجرا سنو کہ غیرے دن پھر صبح کے ہوئے میں والدہ حضرت بے آرام ہوئیں اور کان میں طالبوں کی آواز چھر آئی۔ تب انہیں تشویش ہوئی اور سوچ میں پڑیں کہ بہ لشافت ہے یا کسی آفت کی سناوی ہے۔ اس جانب نے حضرت والدہ صاحب کے سامنے یہ سوال ڈالا۔ حضرت والدہ صاحب نے فرمایا یہ روز الہی ہیں اور بندوں کو ان میں کلام کرنے کی محاذت نہیں ہے۔ پھر وہ سمجھ دے یہ میں چلے گئے اور والدہ حضرت جھرے سے باہر نکل آئیں۔

اس روز شہر میں ایک کھرام تپا۔ دیکھا کہ عجیب سنسوار شہر میں وار و ہوا ہے کہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ بس اس کے مرکب کی ٹاپلوں کی آواز کسی کان میں آتی ہے یہ آواز نہابن جاتی ہے جو بہ آواز سنتا ہے۔ اس پر یہ جزون طاری ہوتا ہے کہ سنتھیار سچ کرن کی راہ لیتا ہے عجیب آواز ہے کہ اس کا سنتے والا لوگ نہیں ہوتا۔ وار و ہاندھو دبو چورسوں میں باندھ کر رکھو گر سے ترڑا سارے بندھن توڑتھیار باندھ گھوڑے پہ بیٹھتیر کی طرح زن سے رن کو جاتا ہے۔ بولوں شہر کے بہت سے جوان گھروں سے نخل گئے اور لوٹتے ہوئے نک میں گم ہو گئے۔

والدہ حضرت نے یہ خبر میں تو اور سر سید و مختار بھویں۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک شب چھوڑ کر پھر ترڑ کے کے سے ہٹڑ بڑا کراچیں اور مجھ سے فرمایا کہ میٹھا سواری نکلتی ہے پھر بعد لمزار کی مانند کا نیٹ لگیں اور مراس سے بولیں «کیا یہ جلال سواری ہے کہ درودیوار ہلتے ہیں اور ٹاپلوں کی دھمک سے گلی گلی گوئی ہے،» اس کلام سے مجھے عجیب پریشانی ہوئی اور سارے دن بیکل و مختار برا جب شام ہوئی اور شمعیں روشن ہوئیں تب میری پریشانی سوا ہوئی۔ دامنِ ضبط ہاتھ سے چھوٹا اور حضرت والد صاحب کی خدمت بایکت میں موڑب حاضر ہو یوں عرض پر دانہ ہوا کہ اسے پدر بزرگوار آپ پر سے میری جاں بشار ہو۔ اجازت ہو تو نبہ ناچیز عرض کرے کہ صبح سے والدہ حضرت کی حالت غیر ہے۔ سارا گھر اوس ہے۔ ہم نے نوا لا نہیں توڑا۔ والدہ حضرت کو خفغان ہوا ہے اور وہ رہ کر ٹاپلوں کی آواز یاد آتی ہے ملے پدر بزرگوار، یہ کیا امر اڑا لی ہے۔ ٹاپلوں کی یہ کسی آواز کا لون میں آتی ہے اور ہم سے کیا کہتی ہے۔۔۔

حکایت مرکب بے راکب کی

حضرت والد صاحب نے تامل کیا۔ پھر شمشیر کو غلاف سے نکال سامنے رکھا اور گویا ہوئے۔ لے فرزتا بہزاد اپڑا ہے کہ حال اس صاحب اعجاز سواری کا صحیح سے کہوں اور ٹاپلوں کی

آواز کی رنگوں کو بیان کروں اے فرزندِ بلند جب جمادی راہِ ثواب طے ہو جائی اور خیر
قابل کا گلوئے مبارک پر پھر جپا تو اس باوفا نے اپنے گردوں وقارِ راکب کے پاک لمو
میں منہ ملا اور خجھے پر جا کر غمِ آسود آواز میں بہتنا یا۔ عالم کی شہزادی یے تباہہ درجیہ پر آئی
اور مرکب کو بے راکب پایا اور خون اس کے منہ پہ ملا دیکھا تو فرطاطم سے زلپیں کھوں دین
اور بامحتوں کی چوڑیاں توڑ دیں۔ پھر سے اپنے والی کی وصیت یاد آئی اور یہ پوشہ منہ
پہ نقاہِ وال نوحہ بلب اس مرکب پہ سوارِ سرگی روہ مرکب وہاں سے چلا اور جنگلوں میں
نکل گیا۔ راویوں نے قیاس کے گھوڑے بہت دوڑلتے ہیں اور موڑخون کا رہوا قلمبست
روان ہوا ہے پر اس مرکب کی راہِ وہرناں ایک ایک رازِ سربت ہے۔

اے جان پدر ماسِ مرکب کی راہِ وہرناں کا سراغ اب کیونکر ملے اور ان جمیون کی تحریر اب
کس طور پر جھی جائے کہ وہ جنگل کٹ گئے وہ میدانِ بستیوں سے بیٹھ گئے اور جمیون کی تحریر
مٹ گئی۔ اس القاب پر جرانی کیوں ہو کہ زمانے کا طور یعنی ہے جنگل کثیر ہیں شہر بستے ہیں
شہرا جڑتے ہیں جنگل بنتے ہیں، جوبتیاں ویران ہو گئیں انہیں سب روئے ہیں گزر عزیزان
جنگلوں کو بھی تو یاد کرو جنہیں بستیوں نے ویران کر دیا۔ اس قطعہِ ارض کے وہ بلند و بالا
شجر کم ہر شجر ایک شہر ہوتا ایک کوچہ اور ہر کلی ایک گلی تھی کہاں کئے اے جان پدر
میرے پدر نے کہ اپنے وقت کا بڑا اہنگ اور عجیب دان عالم تھا جسے خردی ہے کہ
ہمارے شہر سے دور کالے کوسوں ایک گھنی بنی ہے، عجائب غلوقات کی چھاؤنی ہے
حدِ نظر تک درخت، هر درخت ایک شخصیت ہر شاخ ایک ذات ان شخصیتوں میں ایک
شخصیت سب سے الگ ہے ایک بلند و بالا شجر ابتدہ کوئی نہیں جانتا کہ اسکے کس نے لکھا یا
اور کس نے پانی دیا جب جرنلی سڑک ہنیں بنی تھی اور شیر شاہ سوری نے اشجار کو فرمانزدہار
نہیں کیا تھا تب سے وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہے اور آسمان کے بدلتے زماں اور زمین کے
بگڑتے ڈھنگ دیکھتا ہے، بہ درخت ماضی اور مستقبل کے ڈانڈے ملاتا ہے اور جنوب

کو شمال سے جوڑتا ہے۔

ائشوب قلم عصمه اور اق تاریخ میں یوں بعاف ہوا ہے اور راولیوں نے یوں رقم کیا ہے کہ جب حیدر علی مسافر صحرے سے انزو ہمراں ہوا تھا اور بے تو شہ وزاد راہ بکہ و نہایا پیادہ جنگل جنگل خاک چھانتا پھرتا تھا تو ایک روز اسی سفر سے منزل میں اس کا گزر ایک نواح دلکشا میں ہوا۔ دیکھا ایک چشمہ مانند چشمہ جیسا ہوتا ہے کنارے پہ بہر سے نزدک جایا ہے۔ درختوں کا سایہ ہے۔ ٹھنڈی ہوا جلتی ہے۔ مچھلوں کی خوبصورتی ہے جیدر علی نے کہ کئی روزوں کا تھکا آندہ اور جھوکا پیاسا تھا۔ آب خنک کو آپ چیات اور شیر مچھلوں کو حبنت کا میوہ جانا کچے پکے بچل توڑ کر کھاتے، بیانی پیا، منہ ہاتھ دھویا اور پاس ہی ایک آم کے پیڑ کے یچے پڑا رہا۔ از بسکر کی دلوں کا نھکا اور کئی راتوں کا جا گا تھا لیستے ہی نیندا گئی۔ وہ نیند عجب نجھی کہ ہیام بیداری لائی۔ خواب کیا کہ ایک سبز پوش سوار ہے، ہاتھ میں شمشیر آمدار چھر سے پہ لقب ہر چند کہ نقاب پڑا ہے، چھر سے کافر چکلتا ہے جلال ٹیکتا ہے فراتے ہیں کہ حیدر علی اُجھٹ گھوڑا بتا رہے۔ ناد علی پڑھر ہر طراز کر کا نکھ کھوئی تو دیکھا کہ قریب ہری ہری دوب پر ایک دھوپ سا گھوڑا بڑے بچل سے چرتا پھرتا ہے۔ زنگ سفید برائق بالا قد، بلند گرد، گول گول سم ایال پری کے بال، دم رو پہلی چیزوں پا پا راسی تڑپتی رائیں پھر کتے نختے، دھوپ سی چکنی جلد، حیدر علی نے خواب کو بشارت جانا۔ پڑھ کر گھوڑے کو بکپڑا۔ ناد علی پڑھ کر نکلی پیٹھ پہ سوار ہو گھوڑے کو چکارا۔ چکارنے قبی کا اثر کیا۔ رہوار صبا رفتار نے پھر بیداری لی۔ سوار کی رانوں کے درمیان تڑپا، اور سبز سے کو رومنہ تا پھولوں کو چاند تائیر کی طرح چلا کہ طارے بھرنے لگا۔

لکھتے ہیں کہ حیدر علی نے عمر بھرا سی گھوڑے پہ سواری کی اور میدان پہ میدان مارے اور سلطنت خداداد کی بنیاد ڈالی۔ مرتبے وقت بیٹھے کو وصیت کی کہ فرزند دلیند، ہمارا وقت اعزز ہوا۔ ہم سفر کرتے ہیں سلطنت خداداد تمہارے حوالے۔ اسے پھیلاؤ، جنوب کو شمال سے

اور راس مکاری کو ہمارے ملاؤ ہم نے سب روز ملکت تمیں سمجھا تھے اور خزانہ سلطنت ہمارے پرداز کئے۔ ان خزانوں میں سب سے بڑا خزانہ اور سب سے قیمتی امانت ہمارے اسپر دفادر صبار قوار کو جاننا اور روز ملکت میں سب سے گزری روز سمجھنا کہ وہ سلطنت خدا داد کے لئے مانند گاؤں زمین کے ہے۔ وہ بگڑا تو سمجھو کر سارا کھیل بگڑا اور سلطنت خدا داد تمام ہوئی۔ جب کبھی از خود ہنہ نالے تو جاننا کوئی بڑا خطرہ سر پر آیا، انا د علی بڑھنا اور سوار ہو کر میدان کا کوچ کرنا کہ انشاء اللہ نظرت کو ہمراپا پاؤ گے اور ظفر پاپ بچرو گے۔

حضرت ٹیپو سلطان شہید نے اس اسپر دفادر اور روز ملکین و دقار کو اپنی جان سے عزیز جانا اور ہر مرکر کا اس کی پشت پر بگڑا اور میدان مارا۔ آخری معرکہ میں محبی گزری کہ حافظہ کی ذرا سی خطے سے لشائے خطہ ہوا۔ روایت ہے کہ وہ وقت زوال کا تحالوں پلٹتی تھی، لگری پڑتی تھی۔ آم کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں دستِ خوان سچھا تھا۔ اسے پس خضرت ٹیپو سلطان کو کام بہت معذوب تھے اور آم کے پیراؤں کی چھاؤں بہت محبوب تھی۔ قلعہ کے بااغ میں بہت آم تھا۔ قلمرو ہند کے ہر قطعہ ہر زمین سے فلم منگوائی گئی تھی اور اس بو قلموں بااغ میں آلاتہ کی گئی تھی۔ میٹی دور دوز ہوتے لگی تھی۔ ایسوں میں جالی بڑی گئی تھی۔ اسے بسکرموں کی فصل اس برس مندی ہوئی تھی۔ آنہ دھیان مسٹرزاد کا اس برس بہت چلیں اور آموں کی بھری گودیں خالی کر دیں۔ پر اس بااغ کے پیراؤں کی بہت سی شاخیں ابھی ایسوں کے لوجھ سے جگائی تھیں اور پچھی ایسوں کی جگہ سے بسی لگنی چھاؤں میں دستِ خوان سچھا تھا۔ الوارع والوان کا حکانا اس پر چنا تھا، امراؤ وزراء و حضار قطار در قطار بیٹھے تھے اور درمیان ان کے سلطان تشریف فرمائتے۔ طعام تناول کیا چاہتے تھے کہ اصلیں سے اسپر دفادر کے سہنہ نانے کی آواز کان میں آئی۔ حضرت رک گئے رتامل کیا پچر نواہ نوڑا۔ لفڑہ قاب میں تھا کہ ایک بڑا سا ہر اہر پتا ڈال سے لٹٹ کر قاب میں یوں گرا جیسے تیورا نے پاہی کی ڈھال زمین پر گرتی ہے لفڑہ جہاں کا تھاں رہ گیا اس آسمان وقار نے کمال وقار و تحمل سے نظر اٹھا دخالت کی

طرف دیکھا۔ ابھی درخت کو دیکھتے تھے کہ اسپِ وفادار پھر ہنہنا یا اس تندی سے کہ سارا افعو گو سخ گیا اور ٹالپوں سے زمین ہل گئی۔ مطر کرنظر کی، دیکھا کہ اسپِ وفادار اصلی سے راستہ انکل آیا ہے۔ اور اسی نظر میں دیکھا کہ خبر سامورچے کی سمت سے دوڑتا آتا ہے۔ سراسیمہ، باحال پرشیاں مودب صدراوی «سلطان کا اقبال بلند ہو۔ غفار و فادار مارا گیا۔ فوج فرنگ فضیل پر چڑھ آئی۔»

وہ فلک جناب یہ جنسرن جلال میں اونٹھ کھڑا ہوا۔ فرمایا گھوڑا کسو۔ ہما ری جنگ کا بنگام آگیا۔ پھر امراء و وزراء کو اس غضب سے دیکھا کہ ان کے چھروں کے دنگ فنی ہو گئے۔ غیظ میں شمشیر نیام سے نکالی اور نیام کو توڑ ڈالا اور قدم رکاب میں رکھا۔ مجہب ہوا اک سلطان جمال اور محبت میں ناد علی کا ورد بھولا۔ اب گھوڑے کو ایرڑا دیتے ہیں تو وہ ایرڑا ہستا ہے۔ دولتیاں مارتا ہے پر اگے نہیں بڑھتا۔ سلطان کو اس وقت عجب ہر اس ہوا سوئے فلک نگاہ کی، پھر گھوڑے پہ نظر کی اور گوبایا ہوئے کہ «اسے اسپِ وفادار، بھرے چمد م، میرے اخنی، کیا تیرا جذبہ وفا بھی سرد ہوا چاہتا ہے» اس فقرے نے اثر دکھایا۔ گھوڑے نے زمین پہ طاہیں ماریں اور تیر کی طرح زن سے فضیل کی سمت چلا۔ پر اسپِ وفادار کی وفاسے تلافی نہ ہو سکی۔ سلطان جب گھوڑے سے زمین پہ تشریف لائے اس دم انہیں اپنی بھول کا جیال آیا۔ مگر تیر مکان سے نکل چکا تھا۔

اسے پس عزیز ناگا زندگان نازیخ کا اٹھب قلو سلطان کی شہادت کے تذکرے میں خوب جو لانی دکھاتا ہے، پران کے گھوڑے کے ذکر پڑھک جاتا ہے مگر رہوار تخلیل کو کس نے باگ دی ہے اور دل و دماغ میں اتری ہوئی تصویر کو کس نے مٹایا ہے بزرگوں سے پہروا بت سیدنا سیدنا چلی آئی ہے اور سچائی کی آپسخ بن کر سینوں میں دھکتی ہے کہ جب سلطان مرتبہ شہادت پر فائز ہو چکے تھے تو اسپِ وفادار نے خون مبارک میں اپنا منہ ملا اور شہادت گاہ نے نکل گیا۔ خدا گاہ حزین سے نکلا ہوا پہ شرارہ مغلی سے جنگلوں کی سمت نکل

گیا اور شعلہ جوالہ بن کر مجھ کے نگاہ

ساختیم ہوا کہ ایک خدار وزیر نے گھوڑے کو مغل سے نکلتے دیکھ لیا۔ از بسک وہ اس گھوڑے کے اعجاز سے دافت تھا، فرنگی اقوؤں کو خبر پہنچا کہ غضبہ ہوا سلطان کا گھوڑا نکل گیا۔ ٹپو کی شہادت کی خبر اب اُسنے کی اور بستی بستی پھیلے گی جس جو اندر نے جرات دکھائی تھی اور گھوڑے کی بیشتر یہ بیٹھا وہ پڑے ہے کہ اے جان پدر پیر یہ اس معمر کہ میں آخری سازش تھی میں نے اپنے پدھر سے اور پدر نے وفت کہ لٹھراویوں سے نہ ہے کہ رونخ اس بہ وفادار کا درہ خبر کی سخت تھا۔ جب وہ خبر پہنچتا تو جنوب سے شمال تک اور مغرب سے مشرق تک ہنگامہ پیا ہوتا پر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

فوج فرنگ تعاقب میں بھی اور فرس عبارت فدا فرانسیسی بھرتا تھا فاصلے گرد کی مانندی میں ماتھے تھے۔ طالبوں کی دھمک سماں سماں پیچھی تھی۔ اس نک ویو میں ہلہماقی کھینچیاں بہت پامال ہوئیں اور بہت جنگل رومند سے کئے اس صبا قدم رہوار کی خوب چشم تھی کہ گاہ پری کی مثال اپنا جمال دکھاتا اور پہنچتے سے جلتا کر رہا میں پڑا تباش اور سموں میں آیا اندھانہ بھجوٹسا، گاہ پر سرپ دوڑتا کہ چنانوں سے جنگا رہا ملائیں اور سندھوں کا پانی اچھل جاتا۔ بہام اوارہ دشت غربت جب دوڑتے دوڑتے قریب اس بستی کے اس مقام پر آیا اور اس جنگل سے گزر اتو درمیان میں آم کا ایک گھن پڑا۔ اس پری کی مہک عجیب تھی کہ گھوڑا تھنک گیا۔ اے جان پدر جانا جاتا ہے کہ جس درخت کے ساتھ میں سلطان نے آخری لمحہ توڑا وہ اسی بزرگ درخت کی قلم تھی سامنے میں اس کے گھوڑے سے نہ دم لیا۔ ایک فرنگی بند و پیغام غضب کا نشا بخی گھات میں تھا۔ اس نے نشاد باندھا اور ٹمچھ چلا دیا۔

جب فوج اعداء فرب آئی تو دیکھا کہ پری کے نیچے تازہ خون پڑا ہے پر گھوڑا غائب ہے جنگل کو تلبیت کر دیا، میدان سارا چھان مارا، کیوں سراغ اس کا نہ ملا۔ گھوڑا اتنے سے غائب ہے۔ اللہ عالم حاضر و غائب ہے۔ کائنات کا نہایت عجائب ہے۔ بہاں کی ہر نئے عجیب ہر واقعہ

غیرب دیکھی چیزیں ان دیکھی بن جاتی ہیں۔ خیالیں افسانوں کا روپ دھار لیتی ہیں میرے پدر نے مجھے جزدی ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ مرکب کے مثل آوارہ خوبصورتے قرار روح کے جنگلوں میں بھینکتا ہے اس نہر کی راہ سے گزرے گا۔ تب اس کی مانپوں کی آواز نہر پر جھیط ہو گی اور بہت بڑا رن پڑے گا اونٹیزے بانی پردا ہے گا۔

پدر بزرگوار خاموش ہو گئے ہیں دیر گھنٹے پہ مھوڑی رکھے ساکت بیٹھا رہا اور خیالات میں خلطاں رہا۔ پھر میں نے جھر جھری لی اور عرض کی کہ اے پدر بزرگوار آپ نے یعنی سلطان کے گھوڑے کی حکایت سنائی۔ میرے نہ بتایا کہ وہ مثل خوبصوریوں آوارہ اور بے قرار پھرنا ہے۔“ پدر بزرگوار نے فرمایا“ اے پدر اس مرکب کی پشت اپنے راکب کو بکار تی ہے جب وہ راکب پیدا ہو گا اور اس پرسوار ہو رہا ہے جسے گا۔ تب اس پاکیزہ روح کو قرار آئے گا۔ میں نے عرض کی کہ“ اے پدر اس نک رسائی کا کیا طبق اور اس کی سواری کی کیا شرط ہے؟“ پدر نے جواب دیا“ اے پسر میں نے اپنے پدر سے سنایا ہے کہ جو تم باز فتحت آزماس جنگل کا پتہ رکھائے گا اور اس بزرگ درخت تک پہنچے گا وہ اس مرکب کو اس کے گھنے سلے میں کا محظی رکاب سے درست جھر جھری لیتا ہے نہنا اپاٹے گا۔“ میں نے استفسار کیا کہ“ اس جنگل تک پہنچنے کا کیا طریقہ اور اس درخت کو پانے کا کیا ویسے ہے؟“

فرمایا“ جان پدر، بے جنگل انسانی نظر سے گم ہے۔ صرف ٹیوڑاں کا نشان جانتے ہیں اور اس درخت کی شاخ پر عیناً طاڑ ہر آفت ہر بلاد سے غفو فارہتا ہے۔ طویل خوش المahan کہ نعلق قدر کام کے پیڑ سے رکھتے ہیں بیٹھے اس درخت کا طواف کرتے ہیں تب دوسرے درخنوں پر اترتے ہیں میرے پدر نے مجھے جزدی ہے کہ جو فتحت آزماء پنے حوصلہ کو تھا اور طویل خوش لمح کو رہنا بنائے گا بمنزلہ بہ پہنچے گا۔ مرکب کا راکب بن گمشدہ متزلوں کا سراغ پانے کا اور فتح کا ڈنکا بجاوے گا۔“

صاجو اس حکایت عزیب نے تجو پر یہ اثر لیا کہ میندرات کی آنکھوں سے خست ہوئی۔ وہ رات بے آرامی میں کٹی۔ کمی مرتبہ آنکھ لگی اور آپ، ہی آپ کھل کر جب بھی آنکھ کھلی دیکھا کہ نماز کی چوکی پر شمعدان روشن ہے۔ منابات کی کتاب سامنے کھلی ہے، والدہ حضرت مثل بیدر کا بیت ہیں اور رفت بھری آواز میں ورد کرتی ہیں۔ یا عی یا ایلیا یا بو الحسن یا بو تراب، اور والدہ پسح میں عصا ٹیکے کھڑے ہیں اور دبدم بدلتے آسمان کو تکتے ہیں۔ اج وہ پھر جھر سے باہر نکل آئے تھے والدہ حضرت کی رفت بھری آواز یا علی یا ایلیا یا بو الحسن یا بو تراب عجب بخی مینند اس آواز سے کمی بار اچھی۔ پھر وہ ہی آواز غنوڈیں گئی۔ صبح کے ہوں میں آنکھ لگی بخی کہ کسی نے بازو پکڑ کر ہلا یا۔ آنکھ کھولی تو دیکھا والدہ حضرت سر بلے کھڑے ہیں اور بازو ہلا کر فرماتے ہیں۔ ”بیٹھا امکھو صبح کا تارا چمکتا ہے۔ اذان ہوتی ہے۔“

میں اُٹھ بیٹھا دیکھا کہ والدہ حضرت نے مریپ سفید عمامہ باندھ رکھا ہے۔ دوش پر قبا پڑی ہے، کمر میں سر زپنگا بندھلے۔ بڑھ کر بچھے چھاتی سے لگا یا۔ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے جسوس کی کہ جس سبادگ مر سے پرتنک کاپتا ہے اور آواز میں رفت کی بلکی کیفیت ہے۔ فرمائے لگئے ”بیٹا ہم فربند سحری ادا کرنے جاتے ہیں۔ کھر سے خبردار رہنا۔“ میں کچھ نہ سمجھا۔ مکر کے عالم میں سب کچھ دیکھا رہا۔ وہ جناب جب چلنے لگے تب ہوش آیا اور جب ہوش آیا اور جھر جھری تو وہ قدم باہر نکل چکے تھے دروازے کی لندی کھلی اور پھر کنٹھ کھلنے اور دروازہ بند ہونے کی آواز گلی میں گو بجھتی ٹاپوں کی آواز میں گم ہو گئی۔

میں حیران ابتر سے اٹھا۔ سیدھا والدہ حضرت کے جھر سے کی سمت چلا۔ جھر کھولا، دیکھا کہ شمشیر جو شب بھر رہنے جا بکے دوڑ رکھی رہی بخی فامتہ سے۔ میں جھر سے سے نکل سیدھا زینے پر چڑھ گیا۔ آسمان کی سیاہی دھل جی بخی۔ ستاروں کا فاء بکھر گیا تھا کوئی

کوئی ستارہ اوارہ آوارہ دشتِ فلک میں بھگلتا تھا۔ اونچی چھتیں اور مینار اور گنبد ابھی تک سیاہی میں غرق تھے۔ ان چھتوں اور میناروں سے پتھر کیسی دوڑ تو پیش گرج رہی تھیں۔ اور آسمان کا گذارہ سورخ مُرخ لگتا تھا۔ ویکھتے دیکھتے بالا قدم کرب بے راکب کا تصور مکھوں میں بندھنے لگا اور ٹاپوں کی آواز خون کی دعا بن کر رگوں میں گرجنے لگی۔ میرا جنم دلکش نے کا ایک جنون کے عالم میں بیچے اترنا۔ والدہ حضرت پر نظر کی کہ آرام میں ہیں۔ نماز کی جو کی جریانا نماز بچھی ہے۔ مگر کوئی اس کا الٹا ہوا ہے اور شمعدان بچھا بڑا ہے۔ صحن میں ابھی اندر ہمرا تھا۔ بس دیواروں کے اوپری حصے اور مندیر میں اجل گئی تھیں۔ صحن خاموش تھا۔ ملاں کبوتروں کی کاپکوں کے اندر ہنجانیوں کا زمزمر گو نجات تھا اور گلکنے کی آوازیں مثل جوئے طباشير کا بک کے پردوں کو توڑ کر فضای میں بہہ رہی تھیں۔ میں نے اس صحن کو ان زمزموں سے بے بیز کا بک کو، والدہ حضرت کو کہ ہنوز کرام میں تھیں ایک نظر دیکھا اور بے تابانہ دروازہ مکھوں باہر نکل گیا۔

دوستوں میں وہ مارچ کا تھا۔ ماہ مارچ کوچ کرتا تھا اور راتیں چھوٹی دل ملے ہوتے جاتے تھے۔ آموں کی ٹینیاں مول کے شیر میں بو جھ سے چمک گئی تھیں اور بھومنے سے مول کے چھوٹوں بہہ آن منڈلاتے تھے۔ اب تڑا کا تھا اور ایک شاہزادیا دھند کے میں غرق منڈبروں پر آزادا ہے۔ چھمکتی بھسرتی ہوا کم کم چلتی تھی مول کی بھینی بھینی خوبصورتی میں تیرتی تھی۔ بازار بھی بند تھے اور گلیوں میں آمد و فت شروع نہیں ہوئی تھی۔ کہیں دور سے توبہ کے گرجنے کی آواز بدستور آئے جاتی تھی۔

میں دیر گلیوں اور بازاروں میں گھومتا رہا۔ دن اب چڑھ رہا تھا پر بازار اسی طرح بند تھے۔ جلوں ارملے بیا بان، خوشبو راہیں ویران۔ دریچے بند دروازے مغلل۔ جو کہ جہاں بخوبی سے کھوا چلتا تھا اور تڑ کے سے رات گئے تک کھوار جاتا تھا۔ سنان تھا۔ سارا شہر بجا بیس بجا میں کرتا تھا۔ میں اکیدا چلتا تھا اور اپنی آہٹ پر آپ چونکتا تھا۔ ناگاہ

وور ایک سمت سے علم بزرائیک چلکتا ہوا نمودار ہوا۔ علم کی صنو سے آنکھ جھپک گئی۔ علم کے بعد علامہ پر نظر گئی کیا دیکھتا ہوں کہ ناقہ پہ سوار ایک مرغ فازی چلا آتا ہے۔ ایک ہاتھ میں علم بزردوسرے میں نیزہ علم کئے ہوئے بازو غلاف سے الگی ششیروں کی طرح آتیں ہوں سے ابلے ہوئے، سر پہ صید عمامہ، روشن پہ بزر عبا، منہ پہ سیاہ نعاب۔ یہ کا ایک ناقہ تھام گیا۔ ناقہ سوار نے علم کو بلند کیا اور نیزے کو جلسش دی۔ پھر ابھی گر جبار آواز میں نعرہ مارا کہ درود بوار ہل گئے اور پکارا کہ اسے گروہ مردم خبردار ہو کہ ایک بڑا اسیلا ب نہمارے حزاب آباد پہاونڈا ہے اور محلات و مساجد و مقابر کو بسان حس بھالے جانا جاہتتا ہے۔ اسے لوگوں خذل کے گھروں کی بے حرمتی ہوئی۔ انسانوں کے برجوں میں خلعت چھا گئی۔ آفتاب پہ کا لک پت گئی۔ دن میں شب کی سیاہی کا سماء پیدا ہوا۔ اسے لوگوں آج نقد جاں کی قیمت گر کیا اور موت کی قیمت چڑھ گئی۔ بخدا آج زندگی بکھری کی چھینک سے زیادہ وقت نہیں رکھتی اور موت پیش را دے زیادہ شیریں ہو گئی خبردار ہو اسے لوگوں کی پربہت بڑی آزمائش کا وقت آیا ہے۔ دن بولتا ہے اور نہمارے مرکبوں کو پکارتا ہے۔ نہمارے مرکب تھانوں پہ تڑاپتے ہیں اور ان کی پیشی را کبوں کے لئے کل ہوئی ہیں۔

اس خطبہ کا عجب اثر دیکھا کہ سنان رہا میں قدموں کے شور سے گوشے نگیں اور اندر سے بند دروازے دھاڑ دھاڑاٹھلنے لگے۔ جوانانِ صفت سکن بیٹھے تڑاٹنے لگے، متروں پہ عماء رکھے، اکر سے چپکے باندھے، ہاتھوں میں ننگی تکواریں کوئی پاپا ده کوئی گھوڑے پہ سوار گلی گلی سے نکلتے دکھائی دیے۔ دیکھتے دیکھتے ایک شکر ہو گیا۔ تب اس بزرلوشن ناقہ سوار نے ایک جڑا و حنجر موبیوں کا اور بزہ رکا ہوا اکر سے ذکال میرے آگے چھینکا اور نعرہ مارتا ہوا آگئے بڑھ دیا۔ وہ پورا شکر نعرہ زناں اس کے پیچے چلا۔

دم کے دم میں وہ علم بزر، وہ ناقہ سوار، وہ شکر سب کچھ انکھوں سے او جعل ہو گیا اور بانار پھر بجا نہیں بھائیں کرنے لگا۔

بیں سکن کے عالم میں کھڑا تھا اور سوچتا تھا کہ یار بیان کی خواب سا آیا اور جلا گیا
پھر ڈرتے ڈرتے بیں نے وہ خجرا مٹایا کہ اس کے اٹھاتے ہی رگوں میں خون گز جئے لگا اور
کالنوں میں مرکب بے راکب کی ٹاپوں کی آواز گز جئے لگی۔ بیں نے وہ جڑا اور خجرا کمر بیں لگایا
اور گھر کی طرف چلا۔ اسی خواب کی چکا چونداں لکھوں میں سماںی مختی اور رگوں میں خون گز جتا تھا۔
اور کالنوں میں ٹاپوں کی آواز دم بدم گو بختی مختی۔ بیں یہ سوچتا جاتا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ گھر
چل کر رنے کی رخصت یہیں اور رن کی طرف چلیں۔

جب میں اپنی گلی میں مردانو زر الاعالم دیکھا سکوں کے نازہ تازہ بہت سے نشان گویا
اس راہ سے کوئی اشکر گز را ہے، جا بجا شکستہ ددوازے، جالیاں و بیران، درتچے سنسان؛ بیں
جیران کد دم کے دم میں بکیا ماجرا گز را۔ ناگاہ کان میں ایک سر ایمہ طوطے کی آواز پڑی۔ سامنے
کیا دیکھنا ہوں گے، ایک نخا لانشد خاک و خون میں غلطائ پڑا ہے۔ گلاب رخسار کھلا میے
ہوتے ہیوں کی پیکھڑیاں مسلی ہوئی، کابل آنکھوں کا ادھر ادھر پھیل دیا ہوا، جھنڈوںے باول کے
ہائے میں ماتھا خاک سے اٹا ہوا، گلے میں چنسی، پھول بدن میں نشیمنی کرتا پھینی ہوئی مختی میں
یہ خجرا طوطا سر ایمہ پڑی طرح چلاتا ہے اور یہ خبرے میں پھر ٹاکتا ہے۔ گویا اپنے نئے ماں کا
حال جانتا ہے۔ میں عزیزانِ گرامی بہستارہ ایسا لاشاسی مدققا کے کمن برادر کا تھا جس
کی صورت ہماری فضائے قلب میں نتا رہ بن کر چکنی مختی۔ میں سمجھا کہ مقرر اس گھر پر کوئی
بلائے ناگہانی لٹوئی۔ میں نے یہ خبرے کی کھڑکی کھولی کر کھلتے ہی اس کے وہ طاڑیں طاڑی رفع
کے اس قفس سے پرواز کر گیا۔ پھر میں قدم مارتا جیلی بہ پہنچا۔ ڈیور حی خالی پڑی مختی، پچھلے
پھر پٹ کھلانے، مطب بند تھا لیکن پھر بھی نجیے باورہ آیا اور قبلہ حکیم صاحب، قبلہ حکیم صاحب
کر کے بہت پلکارا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اونچی کنگنی سے جنگلی کبوتروں کا ایک جوڑا پھٹر پھٹر کر
نکلا اور پڑھنچا تا اڑ گیا۔ خانہ دولت خالی پڑا تھا۔ انہوں باہر مجاہیں بجا ہیں کرتا تھا۔ میری
پلکار اس بلند سقف وہاں میں بار بار لیوں گو بخی گویا کوئی دوسرے عالم سے پلکار کا جواب

پکار سے دینا ہے۔ سر اول دستور دھڑکرنے رکا اور ڈیلوڑھی سے سرک مگر کی طرف ہو لیا۔
مگر سچا تو بہاں بھی دیوانہ پایا۔ اندر باہر بہت ٹوٹا، بست آوازیں دیں کوئی جواب نہ ملا۔
بھر جھوہ بند تھا اور والدہ حضرت کی نماز کی چوکی بر جانماز بھی بھتی، سجدہ گاہ فریضے سے بھی
رکھی بھتی اور مناجات کی کتاب مکھلی رکھی بھتی کویا باعلیٰ یا ایلیا یا پوامحسن یا بوتراب پڑھتے پڑھتے
اکھٹی ہیں اور جیلی بھی ہیں۔ بھرداں اور کمر سے اور صحن سب سنان۔ بس کا بکون کے اندر ایک
اضطرا ب بہ پا تھا وہ پھر، ہو گئی بھتی اور کبوتر اجھنک ہمیں کھلے تھے۔ بیس نے بڑھ کر کاکبیں
کھو لیں اور کبوتر اندر سے اس اضطراب سے نکلے گویا قیدی خانہ زندگی سے نکلتے ہیں۔ دادا ڈالا
ناندوں بیس پانی بھرا اور بھر کبوتروں سے بھرے صحن بہ آخری نظر ڈال کر باہر نکل گیا۔

گلی میں قدم رکھا تھا کہ ٹاپوں کا شور کان میں آیا۔ میں تیر کی طرح چلا ایک ڈیلوڑھی میں
چھپ گیا۔ ہم ہم ایک بھر سوار مسالہ گلی میں داخل ہوا اور ہمیں ہزوں کرتا وہ مری راہ
نکل گیا۔ میں ڈیلوڑھی سے باہر آیا تو ایک سوار سے دو چار ہوا کہ ذری تھجے رہ گیا۔ میں نے
نام مولا علی کا لیا اور کمر سے جنگر نکال چھینک کر بارا کہ اس کی چھاتی میں جا کر چھپ گیا اور وہ
تیرہ الگ بھوڑ سے سے گر پڑا۔ میں نے جھٹپٹ پٹ اس کے سلحہ آثار اپنے زیب نن کئے اور
بھوڑ سے پہ سوار ہوا بڑھی۔

چلتے چلتے میں نے گلی کے درودیوار پر حضرت سے نظر کی اور مرڑ کر اپنے ہٹر اور اس
حوالی پر نظر کی۔ وہ بام بلند بہت اجائے نظر آئی۔ اپنی چھت پر کیا ویکھا کہ کمسی اکیلی جھتری پر
بیٹھی ہے۔ ملکڑی اک چھت سے اٹھ کر ہوا میں بکھر گئی ہے، لگم کردہ راہ قافلہ کی طرح آسمان
بہوں میں بھیک کی ہے۔ اتنے میں بھوڑ اپنا گلی سے نکل دوسرا راہ مرڑ گیا۔ وہ ملی
گلی، وہ درودیوار، وہ بام بلند، وہ اپنے کو بھٹکے کی اوپر جھتری سارا سماں اٹکھوں سے
او جھل ہو گیا۔

بس گلی سے نکل بازار خاص کی طرف چلا۔ پچھوں پچ مرڑ کے، اتنا ایک بیٹھا اونکھتا

تھا۔ میر سکھوڑے کی ٹالپوں پر بیاس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں مبے دلی سے اٹھا اور سڑک کے کنارے ہوا ایک گلی میں ٹڑلیا۔ آگے کوڑل کی ایک عکڑی سڑک کے وسط میں ہٹکشیاں کرتی تھیں۔ سکھوڑے کو سڑپہ دیکھ کر وہ آہستہ سے اڑی اور ٹالپوں کی زد سے ہٹ کر پھر سڑک پر اُتھ پڑی۔ بندوقوں کی آواز کم جھی دوسرے کم جھی قریب سے سنائی دیتی۔ بہت سور کی آواز کان میں آتی، پھر سننا ٹھا چھا جاتا۔ دفعتاً سڑک کے آخری کنارے پر گردانچتی دکھائی دیتی۔ ٹالپوں کا سور گو سختا۔ گردانچتی، کوئی اکیدا سوار سڑپہ دوڑتا آتا، پاس سے تیر کی طرح گزر جاتا اور پھر سڑک پھایاں پھایاں کرنے لگتی۔ درتپکے کا ذرا کھلتے، جالیوں کے پنجھے سمجھی ہوئی آنکھیں پر لیشان صورتیں ایک جھلک دکھائیں اور اوہ محل ہو جاتیں۔

بازارِ خاص سے نکل میں چھوٹی درگاہ پر پہنچا۔ سکھوڑے کو باہر باندھا، جو نیاں سیر ڈھیوں پر آتاریں اور بحدا حترام اندر داخل ہواد صحن میں قدم رکھا تھا کہ سنگ مرمر کے حوض پر نظر جا گئی۔ ایک غربیستی، سراسر تجلی ہصہ و تھمل کا پیکر، کنارِ حوض نشریف فرمہے اور وضو میں مصروف ہے۔ دفعتاً ٹالپوں کے سور سے صحن گو سخ کیا اور ایک بلند قد کشاہ بدن سوار طاہر ہوا۔ ایک ماخنچہ میں شمشیر برہمنہ، دوسرا ہاتھ فرش کی پشت پر اسی نشست سے بیٹھے بغیر خم ہوئے۔ ماخنچہ حوض میں ڈالا۔ چلو بھر اس فرمایا «اللٰہ دوں، اس نورانی صورت نے کمال تھمل اور سکون سے اس کی حلف دیکھا۔ فرمایا، «مہیں، ہے سوار نے چلو کہ مثل سمندر جو شکھاتا تھا آہستہ سے حوض میں خالی کر دیا۔ پھر ٹالپوں کے سور سے ساری درگاہ گو سخ کی اور وہ فر سنجانی سے میری آنکھیں جنہ جیا گئیں۔ سو دنری گھر طی سے دن نورانی صورت تھی۔ دسوار تھا، مرمر میں حوض مثل چشم پر آب چھلکتا تھا۔

اس معجزے کی جگہا چوند آنکھوں میں لئے، عقیدت کا ایک سمندر بیٹھے میں سنجانے، اللٰہ پاؤں وہاں سے واپس ہو رکاب میں پاؤں رکھا اور سکھوڑے کو ایڑا دی۔ گلی کوچے اسی طرح ہو جتکرتے ہوئے بازاروں کے سرفتوں بکھرے ہوئے۔ ایک کوچے میں مر سیمی

کو سوا پایا۔ دکانیں بہت سی بند ہیں جو بند نہیں وہ بند ہوتی ہیں۔ ان میں اشیاء کے قیمتی بھی ہیں۔ برلن دکاندار نہ خریدار خوب سخنے اٹھتے ہیں، بچیری والے رام سے ٹلتے ہیں۔ اہل محل گھروں میں بند ہوتے ہیں یا یوں نکلتے ہیں گویا بھروسچال میں گھر چھوڑ کر بھاگتے ہیں سادپنے دروازے میں اسی لشان پچاہک دھاڑ دھاڑ کھلتے ہیں بند ہوتے ہیں اور نکلنے والے سرے کھن بازدھ کر نیام تلواروں کے نور کر باہر نکلتے ہیں اور جمی ہوتے شکر میں شامل ہوتے ہیں۔ اس شکر میں بہت زنگ دیکھے کسی سر پر خود رکھا ہے، کسی سر پر عمامہ سمجھا ہے کوئی دوپتو پولی پہننے ہے، کوئی ننگے سر نکل آباہت تلواروں والے تلوار کھاتے ہیں، نیزے والے نیزے ہلاتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں کہ نیزہ نہ تلوار، چاہیا فی کی بیٹی اٹھائے چلے آتے ہیں اور گرگراں اسے جانتے ہیں کسی کسی ما تھی میں خالی چکنی نظر آئی۔ کسی نے غلیل اچھائی، غلے جیبوں میں بھرے اور نکل بڑا رینت برگستوان سے آزاد اس شکر پر کہ مثل گفت بھرے سمندر کے ابتداء تھا عور کرتا تھا کہ ناگاہ وہی علم سبز لکھتا ہوا نظر پڑا۔ ناقہ سوار نافہ پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور پکارتا تھا کہ اسے گردہ مردم خبردار رہو کے سلاپ نم پر اندھہ آیا۔ دن بولتا ہے اور نہ اسے مرکب ہو کر پکارتا ہے تمہارے مرکب تھانوں پر تڑپتے ہیں۔ ان کی پیشیں اپنے راکبوں کے لئے بے کل ہوتی ہیں۔

ان کلمات سے وہ ناؤ کھانا شکر ابل پڑا اور مانند ایک بڑے سلاپ کے سور کرتا بہر نکلا۔ تب میں نے پئے گھوڑے سے کوئی دی اور اس ابتدے سور کرنے سلاپ میں شامل ہو گیا۔ جمیع میں نگاہ چونکی اور سموں اور فدوں سے اٹھتی ہوئی گرد پر دہ بن گئی۔ وہ سبز پوش ناق سوار نظروں سے او جھل ہوا۔ سامنے میدان کا رزار نظر آیا۔ لغوارہ و غابر چوڑ پڑتی تھی۔ شپور کی غریو سے آسمان بہتا تھا۔ فرنا کی لمبی صدرا، جھا بخنوں کا سور اطلیل کی فغان۔ شیروں کے گو بخنے سے گھوڑوں کے دوڑنے سے بن کا پیتا تھا۔ عربی ترکی عراقی بسمی کا تھا۔ دیکھنی قسم قسم کا رہوار جمیع تھا، باریک جلد، سیدنہ کشا وہ بالند سر، ہاتھی ایک سے ایک

زبردست اس تو ڈیں اور دیں غضب سے احتیٰ ہوئیں تو پیس ان پر دھری ہو گئیں کہ گولہ ان سے
ڈکر چڑخ پہ جاتا تھا اور آسمان میں شکاف ڈالتا تھا۔ ہمیں میں ایک ہاتھی بہت
سجا بنا نظر آیا، سوندھ رنگی ہوئی، منشک نقش و نگار سے سجا ہوا، جھولیں زد افست کی
ر سے کلابتوں کے زنجیریں طلا فی، عماری نظری۔ اس نظری عماری میں وہ ملکہ بعد وقار
تشریف فرمائتھی جس کے چہرے کی صنو سے وہ دشت پر آشوب عرش بناتھا۔ زین پہ عنبر
سادا کافرش بجھا تھا اور جنگل اس عطر تن کی خوشبو سے ہمکتا تھا۔ رو برو طوطا چاندی کے
بنخرے میں بند بیٹھا ہوا۔ گرد اس کے ماہتاب کے تاروں کا حلقة گوری گوری صور توں کا
جمیع کوئی سورج پھل سے مگس رانی کرتی ہے کوئی مپنکھا جھلتی ہے، کسی نے گلاب پاش کھولا
ہے اور زخمی غازیوں پر چھپ رکا ہے ار د گرد آس پاس سقے کھار دے کی لگیاں لئے گھوتے
ہیں۔ ہر صرف میں جاتے ہیں پیاس سے جاہدوں کو نژدت پلاتے ہیں، ہر قاب کا چھڑکا اور
کرتے ہیں۔

عماری پہ بلند تاروں میں سے ایک تارے پر اپنی نظر مٹھکی کہ ہائیں شہزاد محل کر
دفعتیا گولا ایک ہاتھی کے برابر اکر گرا۔ عبار اور دھوئیں میں سب کچھ چھپ گیا۔ ہاتھی بگڑا،
سورج پھرا۔ دیکھتے دیکھتے اعدا نے فلک مرتب سواری کے گرد گھیرا ڈالا۔ میں نے نیام سے
شمیزی رکاوی اور حجور سے کو آگے بڑھا سواری کے برابر ہولیا۔ بھوڑ سے جانشار غازی آگے
آئے۔ چھر تو وہ دن بڑا کہ ساری فوج صورت گرداب جکڑیں آئی۔ صھیں موجود کی مثال
ایک دوسرے پر گریں، اور یا نے خون نے سیلا بکیا۔ اس نزیبانشان سواری کے گرد بہت
خون بہا اور اس شمع پر سے بہت پروا نے نثار ہوئے۔ دشمن کو ہم نے قریب پہنچنے نہ دیا۔
اور اس آرام سے سواری کو رن سے نکال کر لائے کہ کبیزوں کے گورے ہاتھوں میں جھلکیں
اسی طور گردش کرتی رہیں، عطر دان پاندان کھلے رہے کہ نہ کوئی عطر کی شیشی شکست ہوئی نہ
کھنچے چونے کی لکھیاں خلط ملٹے موئیں اور جناب عالیہ کے دستِ سیمیں میں نظری کٹوڑا

کوڑے زعفران کے شربت سے ببابب بھرا جوں کاتوں رہا کہ قطرہ شربت کا پوششک مبارک
بیہ نہ ٹرکا۔

دن میں تن بدن کا ہوش کہاں تھا۔ وہاں سے سکھے تو اپنے حال پر نظر کی بدن زخموں سے
چورا ہو۔ میں خراپور دیکھا۔ نقاہت طاری ہونے لگی۔ رکابوں میں قدم ڈھیلے پڑ گئے۔ ہاتھ سے
باگ چھوٹنے لگی۔ نیم عنشی کے عالم میں میں نے خسوس کیا کہ کوئی مجھے سہارا دیتا ہے بھرا درگرد
کی چیزیں دھنڈلاتی جلی گیں۔ ہوش و حواس پر اک پرده پڑتا چلا گیا۔

جانے میں کتنی دیرخش رہا۔ جب ہوش ہاتھوں کی محنت سے منجھے سندھوں میں
موی شتعیں روشن تھیں۔ سونے چاندی کی منتلوں میں عبر و عود جلتے تھے مگر والوں میں
اگر تباہ سکتی تھیں۔ فقط ایسی چنگا ریاں تباہ کی تو کوں برداشتی ہوئی، مکتے دھوکیں کی
نیلی سرہنی دھاریاں بل کھاتیاں ان سے نکلتی ہوئی مجھے الخلق سنگھایا جانا۔ گلاب منہ بہ
چھڑ کا جاتا تھا۔ خوشبویں رنگا زمگ دماغ میں چڑھتی تھیں۔ بدن میں ایسی تھیں مگر ان
سب سے بڑھ کر نہ ک اس عطر تن کی تھی جس کے خملیں زانوپر سرہمارا لکا تھا لمبی نرم
الگلیاں پیشانی کو جبوتو تھیں، پھر بالوں میں سرسر لئے لکتی تھیں۔ ان الگلیوں کی گردش نے
یہ سمجھل کیا کہ جیدار ہوتے۔ حواس پر بھر غنوادگی کا پرده چڑھنے لگا۔ زخموں سے ڈھال جسم کو
اس سمجھے بہت سکھ ملا۔ سارے بدن میں ایک یونہد بھری شیریں رو سرسراتی تھیں۔ جی چاہا کہ
اس سمجھے خملیں زانوپر سرہونی ٹکارہے اور بدن میں وہ یونہد بھری شیریں رو اسی طرح
سرسراتی رہے۔ ہوش و آگئی پر چھا جائے، انہیں پہاکرے جائے مگر اسی اثناء میں اس نے
خادمه کو پکارا۔ اس نے ہر طریقہ کرنا میں کھول دیں۔ کیا دیکھا کہ شہزاد مل سرہانے بھٹھی ہے۔
دستِ حنائی سے پنکھا جھلکتی ہے، گلاب پاش سے بار بار عرق یہ رے بھرے پر بھڑکتی ہے۔
میں مارے بھرا ہٹ کے اٹھا چاہتا تھا کہ اس نے آہستہ سے میرا سرخاما اور بھر زانوپر رکھ
لیا۔ ہماری آنکھیں چار ہو گیں۔ میری آنکھوں میں غیر متوقع وصال کی خوشی اور حیرت کے

سو ابھی کچھ سوال بتتے۔ اس نے ان سوالوں کا منہ سے کچھ جواب نہ دیا بلکہ اس کی آنکھ بھرائی۔ میں اس معموم چہرے اور بھری آنکھ کی تاب نہ لاسکا اور انکھیں بند کر لیں۔ عجیب و سو سے اور واپسے دل و دماغ میں منتڑانے لگے۔

”تمہارے والد صاحب، وہ رک گئی۔ بلوٹنے سے پچھے ہی اس کی آواز نہ صحتی میں اس نے توقف کیا۔ پھر بھلی ہوئی آواز میں بولی ”تمہارے والد حضرت صبح کی نماز کے لئے ایسے گھر سے نکلے کہ پچھر گھر نہیں آتے آج صبح بہت نمازی گھر والپس نہیں آئے۔ یکسی کیسی وحشت ناک خبریں اور بدشگنی کے لکھے سننے میں آئے۔ کوئی کہتا تھا کہ مسجد کے مینار سرگاؤں ہیں اور صحنِ مسجد میں نمازوں کا خون بہتا ہے کوئی خبر لا یا کہ ایک ناقہ سوار سبز پوش آئے ملتے۔ نمازوں کو ان کے پیچے جاتے دیکھا تھا۔ بدشگنی کے لکھے ایسے منہ سے نکلے کہ جونہ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ گلی کے پھروارے تو پیش و غنیمہ لیں، ہو یا اور گرے لیں۔ بابا جان نے سادے کتبہ کو ساتھ لیا، تمہارے گھر گئے خالہ حضرت کو ہمراہ لیا اور بھری ہوئی پھر ڈنگل پڑے۔ ابھی بدھوایی میں نکلے کہ کوئی سامان ساتھ نہ لیا تھا۔ میاں نے پنجھرا طوڑے کا ضرور ساتھ لیا تھا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ توقف کیا، پھر گویا ہوئی۔

”لبس نقد دم لے کر چلے ہتھے لیکن اس نقد دم کو بھی بچا کر نہ لاسکے۔ کلموں نے گوروں کی پیش گھم گھم گلی میں گھس آئی اور ان کی گولیوں سے بھاڑ میں چلنے سے بھلنے لگے۔ میں کم خنثی ماری دیکھا رہی ہوں کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی رہنے تین بدن کا ہوش نہ پڑے لئے کی سرده، بھاگتے میں چادر بھی اتر گئی۔ مجھے بدِ ضیب کو ابھی اور دن دیکھنے تھے کہ شاہی خادم نے جو جناب عالیہ کے مراجِ اقدس کا حال کے کر بابا جان کے پاس حاضر ہوا کرتا تھا۔ آج بھی اسی فرمات سے اس طرف آتا تھا، مجھے دیکھے پایا کمال شفقت سے میرا ہاتھ پکڑا اور جناب عالیہ کی خدمت میں گردی کرنا پہنچا۔ اس نے اپنا عامہ نہ میں پہ مچھینگ دیا اور کہا کہ اے جناب عالیہ میرے ماں باپ آپ پر سے فدا ہوں

وہ حکیم دانا فخر الاطباء اور سلطان طالبیں زمان، جا لینوس دواریں، نباخ حضور کامز ارج داں
ازاج پر انور کا آج زمانے سے اٹھ گیا۔ جام شہادت نوش کر گیا۔ اس کی یہ دختر بدراخت
بے مقنع و چادر گھر سے بے گھر ہوئی ہے، نرغہ اعداء سے پیچ نکلی ہے۔ خارم دولت نے
اسے سر برہنہ باحال پریشان بھلکتے دیکھا۔ اسے بعد تو تیرہ مردہ لایا اور حضور میں فلک جانب کی
پیش کر دیا۔

جانب عالیہ یہ خبر سن ملوں ہوئیں، بندی کو شفقت کی نظر سے دیکھا، سر پر ہاتھ پھرا
اور اپنی گنیزی میں لے لیا، بولتے بولتے وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آواز بھرائے لگی بھتی پھر میں
نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کئے تھے محسوس کیا کہ جس زانو پر اپنا سر رکھا ہے اس کے جسم کی
پوری عمارت گویا بھوچاں سے ہل گئی ہے بھرایک گرم آنسو ٹپ سے میری پیشا فی پر
گرا میری ہتھ پڑی کہ آنکھیں کھوں کر دکھیوں۔ آنکھیں بند کئے دم سادھے لیٹا رہا وہ
زیبا عمارت ہلتی رہی اور میں دم سادھے آنکھیں بند کئے چپ لیٹا رہا۔

صحیح ہوئی تو میں نے اپنی جوتی یہ جوتی سوار دکھی۔ ماتھا ٹھنکا کہ اللہ جبرا کرے اب کیا
سامنے آتا ہے اور چرخ کچ رفتارہ بھل کن جنگلوں اور دیسیوں میں چھرا تا ہے مانسے میں
شہزاد محلِ شویش سے بولی کہ الہی خیر میری یامیں آنکھ کیوں بھڑکاتی ہے میں نے اس
کی طرف اس نے میری طرف دیکھا۔ دونوں طرف آنکھوں میں شویش بھتی اور آنکھوں کی
پتیلوں سے پرے ذہن کے کسی پرے دے میں گناہ اندیشہ مہم و سو سے منظر لا
رہتے تھے۔

جب ہم نے ار د گرد نظر ڈالی تو چاروں طرف اداسی کا سماں نظر آیا۔ خدام شی
خاموش غلکیں گنیزیں خواصیں چب چاپ اداس کوئی زبرد نہ خداں چھڑی کئے
کسی دور کے خیال میں گم ہو گئی ہے۔ کوئی نرگس اسaba دیدہ جیراں کھڑی کی کھڑی رہ گئی ہے
کوئی سر نیوڑھاتے چب بھٹی ہے، کوئی آہ سرد بھرتی ہے۔ کسی کی آنکھوں میں گرم گرم

ہنسروں میں استنسار کیا تو بہت چلا کہ جناب عالیہ نے خواب میں سلطان عالیٰ کا دیدار کیا ہے۔ اس وقت سے صورتِ مکھوں میں پھر تی ہے، یا سلطان کی ستائی ہے جناب عالیہ کو دیکھ کر خدا کا ن عالیٰ بھی اداس و فکر مند ہوئے ہیں اور سلطان عالم کو یاد کرتے ہیں۔

جب جناب عالیہ نے سلطان عالیٰ کی یاد میں ہنسنے بولنے سے کناہ کیا اور کھانا پینا ترک کیا تو مٹھوں نے زبان کھو لی دحت اللہ، پاک ذات اللہ، صحیح تو خدا، خدا کا رسول تو غافل نہ ہو خدا کو نہ بھول جگ جگ جیا کرو نام نبی کا بیسا کرو۔ اُنھوں فقیرِ حمل مکہ کو سے

ان في الجنة قصرلين لعلی ولزہر الحسین حسن

بی بی کا مٹھو، بیگم کا مٹھو یوں عرض کرتا ہے کہ بیان سے مشرق میں برس دل کی راہ ایک گھنا جنگل ہے جنگل سے پر سے دریا ہے، دریا سے پر سے سمندر ہے سمندر کے گناہے ایک بند ہے، وہاں فریگوں کا ڈیر ہے، دشمنوں کا گھرا ہے شہر کی چھوپلیج بیج ایک برج بلند مٹی کا بنایا ہے، اس برج کے اندر ایک باغ ہے باغ میں سرفکا ایک شجر ہے، سرو کے شاخوں میں ایک قفس آہنی کہ میرے قفس سے بہت مفبوط ٹھکا ہے اس میں ہمارے سلطان ذی نشان عالیٰ مقام مثل اپنے مٹھو کے مقید ہیں اور وقت کا انتظار کرنے ہیں کہ کب قفس کی تیلیاں ٹوٹیں اور کب سونے وطن مراجعت فرمائیں اور درود بوار کو اپنے درود سے معطر و معنبر فرمائیں۔

جناب عالیہ نے طوطے کی زبان سے یہ کلمات سننے تو دل میں طائر کی طرح پھر کا اور عقل کے طوطے اڑا سفر پر روانہ ہوئیں۔ وہ طائر ہمدرد اور جانور سحر بیان پھر جو چہما یا رحمت اللہ پاک ذات اللہ، صحیح تو خدا، خدا کا رسول۔ تو غافل نہ ہو خدا کو نہ چھوپلیج بیج میں بھیج دن یہ عرض کرنے کی جرات کرے کہ اس سفر اور

سفر کی صورت ایک ہے۔ رنج سفر مصائب شہر بشر قسمت میں لکھے جائیں گے کوچہ گزدی با دیر پیمائی دشت نور دی حضور کا نصیب ہو گی اور منزل موہوم، انجام معلوم کر فرنجی پریلار بندوقوں اور طنخوں سے بسیارہ بارہ چوبیں لکھنے باغ کے ارد گرد پھرہ دیتے ہیں۔ اور آدمی تو کیا پرند کی مجال نہیں کہ اس باغ میں پرمار جائے۔

خدام دولت نے طانڈ کی زبان سے یہ کلام سنتا تو دہائی دی کہ قیامت ہے کہ آگے سلطان عالی گئے۔ اب ملکہ عالیہ جانے پر تیار بیٹھی ہیں۔ شوکت سلطان کی حضرت ہو گئی۔ اب زینت سلطنت کی حضرت ہوتی۔ مشتر میں خدر پڑے گا۔ اندھیر ہو جائے گا۔ پھر کیا تھا شہر کے کوچے میں خیرگشت کر گئی کہ آج رونق شہر کی رحبت ہے۔ زینت سلطنت کی فرقت ہے۔ ملکہ عالیہ کا شہر سے سفر ہے بستی کے اجر نے کی خبر ہے۔ سینکڑوں مردوں پر یوں بندے زنان اشک فشاں ہمراہ ہوئے غریب الوطنی پر بنیار ہوئے۔ غازی مکبوں پر زیبوں کو رکھ، عمامہ مردوں پر باندھ، عبایمیں دوش پر ڈال، ہتھیاروں سے آراستہ ہو نقد جاں لٹانے پر سفر بیس مر جانے پر تیار ہوئے۔

اس پنگام میں مجھے والحضرت کافول دربارت ہمسفری طاہر یاد تھا اور جناب عالیہ کی خدمت میں حاضر ہو یوں عرض پرداز ہوا کہ ملکہ عالم سفر پر خطر اور منزل دور ہے تین گھنٹے میں ہے۔ کثیناں محلہ محلہ پھر تی ہیں اور سواری افس کی نقل و حرکت کی ٹوہ لیتی پھر تی ہیں۔ بغل میں جاسوس ہیں صفوں میں غدار ہیں کہ گھڑی گھڑی کی خبر اعدا کو پہنچاتے ہیں۔ پس اس سفر میں اختبا ط لازم ہے۔ خادم دولت کو اجازت ملے کہ وہ آگے روانہ ہو، اطلاع اس کا رہنا ہو۔ راہبوں کے نشیب و فراز دیکھتا چلے، اور پنج کی خبریں دبند پھینکتا ہے ملکہ عالیہ کو یہ تجویز بہت بھائی۔ فوراً قلمدان منگا ایک شقہ سلطان عالی مقام کے نام لکھا اور موتیوں کے درمیان رکھ رہا۔ ایک شبنم کا اور پلیٹ ہمراہ انگو بھٹی کا فی چھنگلیما کی بیٹور لشا فی ساتھ میں رکھنے سے کے پسروں کی ملکہ عالیہ سے رحبت لے شزاد

محل کے پاس گیا۔ لیکن اس کے سامنے جلتے ہی میرے ہونٹ پل گئے۔ بہت ہمہی باندھی مگر یہ خبر سننے کی تاب اپنے میں نہ پائی۔ اس نے مجھے اس تذبذب میں مبتلا دیکھا تو خود ہی کر دیا۔ تب میں نے جھوکتے جھوکتے اس پہاڑا عزم سفر طاہر کیا۔ منہ سے وہ کچھ نہ بولی بلکہ جھر سے کارنگ پیدا ہلدی پڑ گیا۔ دیر وہ جیکی بیجھی رہی۔ میری بھی بولنے کی محنت نہ پڑی، پھر وہ گھبراہٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

گھبراہٹی وہ بے سبب بے خصوصی میں صحن سے دالان میں دالان سے کمرے میں پھری رہی۔ دبی زبان سے کئی بار کہا، «اللی خیر کرے صحیح سے باہیں آنکھ پھر کتی ہے؟» تب ایک کنیر نے ٹوکا ڈبی ڈپتے وقت بُشکنی کا کلمہ منہ سے نہیں نکالتے، «اس سرزنش پروہ بخوب ہوئی۔ تب اس نے مت مانی کہ خیریت سے والپس آؤ گے تو چھوٹے حضرت کی حفظی مکھداوں کی ہاسونے کا علم چڑھاؤں گی۔» چھراس نے چاندی کا روپیہ لے کر شبدت کی وجہی میں لپٹا اور میرے بازو سے باندھا۔ بولی «امام ضامن کی ضامنی میں دیا۔ جیسے پیٹھ دھاتے ہو ویسے صورت بھی دکھائیو،» اور اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے بتے تاب ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ روپڑی تب دامن صبغت میرے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ میں نے بتے تابانہ بڑھ کر اسے سینے سے لگایا۔ سینے سے لگانا قہر ہوا۔ اس نے میرے فنا نے پرسر کھ دیا اور چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی۔ ان گرم اسکوں نے میری آنٹش محبت کو اور بھڑک کایا اور میں نے بے صبغت ہوا اسکوں کی دھاروں سے بھیگے رخاروں پر ہونٹ رکھ دیے۔ وقت وداع اس وفات شاعر نے میری رکاب تھام لی۔ میں دیساں کی زلفوں میں اٹکلیاں بھیرتا رہا کہ زلفوں سے بھٹک کر میں گردن پڑا کلب رخاروں پر پنکھڑی لبوں پر بھٹک بھٹک گئے اور میرا دماغ اس سمن بو عطر پیر ہن کی خوشبو سے بس گیا۔ ایک نشر کے عالم میں میں نے رہوار کو اپڑ دی اور سفر پر گامزن ہوا۔

شعر سے نکلنے نکلتے سامنے اپنا خاندانی گورستان نظر آیا۔ معاذیل ایک آج ہم اجداد

کی زمین جھوڑتے ہیں، جانے کب پلٹیں، پلٹیں نہ پلٹیں۔ ان اب وجد کی یاد آئی کہ گزرے ہوئے متبیں بہت گئیں بچونمازنگ مزار اسی طرح چلتے ہیں اور مرکے نگر مزار اسی طرح لو دیتے ہیں گوا بھی تدفین ہوتی ہے اور ان مظلوم بدنصیب بزرگوں کی یاد آئی کہ ابھی دنیا سے اٹھتے ہیں پر جانے کسی بھل کس بن میں پڑتے ہیں کہ لحد کی آغوش بیسر آئی۔ نکفن کا آنجل نصیب ہوا۔ کیسا خیال تھا کہ ساختہ آنکھ بھرا گئی کہنہ قبور کے درمیان ایک ہر فی کو جیران جیران پھرتے اور کسی جستجو میں بھکتے دیکھا تو جب ساخیال آیا کہ ہمیں جانے سے روکتی ہے میں نے جلدی سے ادھر سے نگاہ پھیلی اور گھوڑے کو اپڑ دی کہ دم کے دم میں ہوا سے باہمیں کرنے لگا اور شہر پناہ سے دوز تکل گیا۔ ایک نیل کنٹھ باہمیں سخت کے ایک بخحر سے کہ بر قتار میں جکڑا اکھڑا تھا۔ رڑا رہا اٹھا اور سامنے سے رستہ کا ٹتا ہوا دامیں سخت دوز تکل گیا۔ میرے قدم رکے پرد دسرے ہتھی میسرے چاک رہوار کی پشت پر پڑا اور ٹھاپوں کی گونج میں دور دراز فاصلے کم ہوتے نظر آتے۔

”میں دن میں اس طبق سفر کرتا رکھ کہ جسم فرس کی پست سے پیوست اور نظر میں آسمان پر جہاں طوطا پرہواز کرنا چلتا نگاہ گویا ایک ہری بھری کیا ری فضائیں تیرتی بھتی اور تمہرے سایہ کرتی چلتی بھتی تیسرے دن سفر نے طول کھینچا کہ نام پڑ گئی اور آس پاس کوئی بستی نظر نہ آئی کہ بسیرا کریں۔ رہوار تیز گام درماندگی سے قدر کے سُست گام ہوا اور نظر اب بھی اس ہری بھری کیا ری سے بچک بچک جاتی بھتی۔ ناگاہ آسمان پر ایک ستارہ دمدار نظر آیا۔ دل دھمک سے رہ گیا اور بسیروں طرح کے دوسوں نے گھبرا اور سوسو ترف گماں گیاتا دیساں ستارہ دمدار کو تکتا رہا۔ اور جلسا رہا۔ چلتے چلتے یہاں کیاں طوطے کا خیال آیا۔ اب جو اس منحوس ستارے سے نظر ہٹاتا ہوں اور اس سبز کیا ری کو ٹھوٹتا ہوں تو اسے ندارد پایا۔ ستاری چال مجنول گیا۔ رستہ سفر کا مم کیا۔

ٹوٹے میان بولتے بولتے جب ہرگئے، ہم تجھے کدم لینے کو رکے ہیں لیکن دبر ہو گئی اور

دہ گم سک آسمان کو دیکھتے رہے۔ رات بھیگ جلی تھی۔ طوٹے کی قبر پر سایہ کر۔ اگر اپنے چاندنی میں
ٹوبا اوس میں مہنا یا چبکھڑا تھا اور مول طوٹے کی قبر سے پرے یوں بکھرا پڑا تھا جیسے اوس
کے ساتھ برسا ہے۔ طوٹے میاں نے جنبش کی، سامنے پڑے ہوئے راکھ کے ذہر کو جھٹی سے
کر دیا، سلگتے پلے کو چلم میں رکھو، چلم منہ میں لمبی بیٹھ لئے اور بچھر آسمان کو دیکھنے لگے جیسے
ٹوکنے اور پوچھنے کی کہ آگے کیا ہوا جرأت نہ ہوئی۔ رات بھیگ چلی تھی اور ہمیں بلکہ ہلکی ہر دری
لگنے لگی تھی۔ چبچپ وہاں سے اٹھتے اور اداس اداس بکھر کو پلے۔“

حکیم جی چبچپ ہوئے۔ عدالت علی کے ہاتھ سے حفظ کی نئے کے راستے کی طرف موڑی
ادا نکھیں بند کر خاموں میں پینے لگے۔ دیر تک خاموش فضائیں صرف حفظ کی گڑگڑا ہٹ
گو سنجھتی رہی۔ پھر حکیم جی بولے «جنتی آدمی تھے۔ دوسروں کے لئے بہت تکلیفیں اٹھائیں مگر
جب اپنا وقت آیا تو کسی کو تکلیف نہ دی۔ ہم میں سے کسی کو بھلی بستہ نہ چلا۔ میں اناصر و رویکھا
کہ خلاف معقول اول شب ہمیں رخصت کر دیا اور بھرے میں جا کر پڑے رہے۔ اللہ دیا کہتا
خفا کہ صحیح کو طوٹے بہت ہجھ رہے رہے تھے جب بہت دیر انہیں چینتے چھینتے ہو گئی
تو میں باغ سے نکل طوٹے میاں کی طرف آیا۔ پرانی طوٹے میاں تھے ہی نہیں لبٹ طوٹے چلا
رہے تھے میں حریان کہ طوٹے میاں کو آج کیا ہوا۔ بھرے کو کھکھلایا۔ کوئی نہ بولے۔
پھر دروازہ کھولا۔ طوٹے میاں کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ میں بالکل یوں سمجھا کہ طوٹے میاں
سو رہے ہیں۔“

عدالت علی خاموش حفظ پینے رہے۔ پھر بولے «حکیم جی بہت رات ہو گئی۔“
حکیم جی بولے «لو تجھے تو قدر سنا نے میں رات کا پتہ بھی نہ جلا۔ بہت دیر ہو گئی۔ تجھے
آ صبح سویرے اٹھنا تھا۔“

حکیم جی کروٹ لے کر سو گئے۔ پھر عدالت علی کی آنکھیں نیند سے بوچبل ہوتے
لگیں۔ نصیر نے دیر ہوئی خرائی لیتے شروع کر دیتے تھے۔ مگر عنی کی آنکھوں سے نیند

ناسب ہو چکی تھی۔ بھرگی کی چار پانی پہ جلت لیٹا ہوا، آنکھیں آسمان پڑتا روں بھرا آسمان
 اسے یوں لگا کہ نعلوں کی کیلیں میدان میں بھرگی ہیں اور اپنی ضوسے ان بلند قد بالا گردان
 مرکبتوں کا نشان دیتی ہیں جو اس راہ سے گزر کر دور دراز میدانوں میں سکھ گئے ہیں مشرق
 کی سمت میں اسے ستاروں کا ایک بھرمنٹ نظر آیا کہ گھوڑے کے سم کی شاہت رکھتا تھا۔
 وہ دیراں جھرمنٹ کو تکتا رہا اور اسے یوں لگا کہ وہ دور سے آتی ہوئی ٹھاپوں کی آواز
 سُن رہا ہے۔
